فکر و نظر

غلامی اور آزادی

عذاب کا فرشتہ ہاتھ میں ننگی تلوار لیے کھڑا ہے
اور.....اسے کسی بھی وقت حکم ہونے والا ہے **'بزن'**
بزن.....اس قوم کی گردن.....جس نے بدعہدی کی
جس نے کہا: اے اللہ! ہمیں ملک دے تا کہ.....
تا کہ ہم تیری 'غلامی' کریں
اور جب ہم نے ملک انہیں دے دیا.....تو انہوں نے بدعہدی کی
بدعہدی.....ہاں! انہوں نے سمجھا.....یہ 'آزادی' ہے
مادر پدر آزادی.....
آزادی نافرمانی کی، منافقت کی، معصیت کی
آزادی چوری، ڈاکے، رشوت، کرپشن، بھتہ خوری کی
آزادی بدمعاشی کی، تین تین سال کی بچیوں کو ریپ کرنے کی، قحبہ خانے سجانے کی، پھر مظلوموں کی ویڈیو بنا کر انہیں بلیک میل کرنے کی۔
آزادی میڈیا کے ذریعے رقص و سرود اور فحاشی پھیلانے کی
آزادی ملک و قوم کو بیچنے کی، اغیار کی غلامی کی، اغیار کی فکر و تہذیب کو اپنانے کی
آزادی حرص و ہوس و حسد کی، مال و دولت کی پرستش کی اور دنیا کو عیش گاہ سمجھنے کی
آزادی گردنیں مارنے اور ٹارگٹ کلنگ کی، بوری بند لاشوں کی اور زندہ جلانے کی
آزادی عافیہ کو بیچنے اور 'بتول' کو ملالہ بنانے کی

اے قوم! رو، گڑگڑا، معافی مانگ.....درِ توبہ ابھی کھلا ہے
ہاں! معافی مانگ، اپنی بدعہدی کی، اپنی منافقت کی، اپنی معصیت کی
تم نے کہا تھا: اے اللہ! ہمیں ملک دے.....اپنی 'غلامی' کے لیے
اور تم نے اسے 'آزادی' سمجھا.....ہر غلط اور برا کام کرنے کی آزادی

ورنہ......ورنہ
عذاب کا فرشتہ ہاتھ میں ننگی تلوار لیے کھڑا ہے
اور......اسے کسی بھی لمحے حکم ہو جائے گا **'بزن'**
"فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ" دفع دور ظالم قوم

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ایک 'عام آدمی' میں اور ایک 'بڑے آدمی' میں کیا فرق ہوتا ہے؟ ہمارے فہم کی حد تک بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنے آئیڈیلز کے مطابق زندگی گزارے اور جو شخص اپنے آئیڈیلز کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے دنیا بھر سے لڑ جائے وہ تو 'بہت ہی بڑا' آدمی ہوتا ہے۔ اسی طرح 'لیڈر' وہ ہوتا ہے جو قوم کو اس کے آئیڈیلز کے مطابق چلائے اور جو اپنی قوم کو اس کے آئیڈیلز کے مطابق چلانے کے لیے دنیا بھر کی مزاحم قوتوں سے ٹکرا جائے وہ تو 'بہت ہی بڑا لیڈر' ہوتا ہے۔

......وہ اپنی جوانی میں اس طاغوت سے لڑتا رہا جو اسے اور اس کی قوم کو اپنے آئیڈیلز کے مطابق زندگی گزارنے میں مزاحم تھا اور زندگی کے آخری حصے میں وہ اس شیطان بزرگ سے لڑتا رہا جو اپنے الحاد کو دنیا کو 'واحد حق' ماننا ہی نہیں، دنیا کو بجبر اسے ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ نہ صرف دنیا کی سپر پاور ہے بلکہ سارے عالم کفر کی طاقت اس کی مٹھی میں ہے......لہٰذا وہ ایک 'بڑا لیڈر' تھا۔

لیکن اتنا ہی نہیں ہوا۔ اسے چند سال ایسے بھی ملے جس میں اس نے اپنی قوم کو اس کے آئیڈیلز کے مطابق چلا کر دنیا کو دکھا دیا جب کہ سارا عالم کفر اس کا مزاحم تھا اور ۵۷ 'آزاد' مسلم ممالک کے 'غلام' حکمران اس کے ناصح تھے کہ 'ارے انگارا ہاتھ میں پکڑتے ہو' پس ثابت ہوا کہ وہ 'بہت ہی بڑا لیڈر' بھی تھا۔

...... ملا عمر! تیری عظمت کو سلام

اے اللہ! اپنے بندے کی لغزشوں سے درگزر فرما، اس کی حسنات کو قبول فرما اور اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرما (آمین یا رب العالمین)۔

برگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

تعلیم و تربیت

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

دینی مدارس کے فضلاء کے روزگار کا مسئلہ

۱۹۳۷ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے برصغیر کے نامور عالم دین اور مدرسہ دیوبند کے صدر مدرس مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، اس کا جو حصہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے، وہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔ اس کے بعد مولانا کے موقف کی تائید میں ہم بھی کچھ گزارشات پیش کریں گے تاکہ پاکستان کے دینی مدراس اور وفاقوں کی قیادت خصوصاً حضرت مدنیؒ کے ہم مشرب وفاق المدارس العربیہ کے قائدین اوران سے ملحق دینی مدارس کے کرتا دھرتا حضرات ان پر ہمدردانہ غور فرماسکیں۔ مدیر

''چونکہ اسلامی تعلیمات، اسلامی تواریخ، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدن، اسلامی علوم و فنون، یہ سب عربی زبان میں ہیں، اس ساڑھے تیرہ سو برس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے مذہبی اور تمدنی انقلابات برپا کیے ہیں اور علوم وفنون کے بہت سے شعبوں میں مسلمانوں کا مستقل اور پائیدار اثر قائم ہوا ہے، اور یہ سب کچھ عربی زبان میں ہے۔ مسلمانوں کے خاص خاص علوم ہیں جو اور کسی زبان میں پوری طرح نہ مکمل ہوسکتے ہیں نہ ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ جیسے حدیث، تفسیر، اصول، اسماء الرجال وغیرہ۔ الغرض مسلمانوں کا سارا علمی سرمایہ عربی زبان میں ہے، اس لیے من حیث القوم مسلمان عربی تعلیم کے لیے مجبور ہیں۔ نہ اس کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ان کو چھوڑنا چاہیے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ صرف ہندوستان میں شاید کئی لاکھ مسلمان ہر سال عربی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں اور ہر سال ہزاروں طالب علم آٹھ دس برس کی محنت شاقہ کے بعد سندِ فراغ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لیے بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہی لوگ قومی اور مذہبی رہنما اور قومی رہبر ہوتے ہیں، مگر معمولی بسر اوقات اور اپنی قوت سے قدر کفاف حاصل کرنے کا موقع بھی ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رہنما ہوتے ہیں مگر محتاج، رہبر بنتے ہیں مگر مفلس۔ اور احتیاج کی وجہ سے جو جو خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں وہ ہوتی رہتی ہیں۔

یہ چیز ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو عربی تعلیم سے روک دیا جائے اور روکنا مناسب اور جائز بھی نہیں ورنہ یہ مسلمانوں کی مذہبی اور ملی تباہی کا باعث ہوجائے گا۔ لہٰذا کیا مسلمانوں کی اس تعلیمی کانفرنس کے لیے یہ امر غور طلب نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی تعلیم کے مسئلہ کی طرف اپنی مکمل توجہ منعطف کرتے ہوئے عربی تعلیم یافتہ اشخاص کے ذرائع معاش کے مسئلہ کو حل کرے۔

یقیناً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مسئلہ سے اب تک بہت بڑی غفلت برتی ہے۔ شکایت کی جاتی ہے کہ اچھے علماء پیدا نہیں ہوتے، مگر اچھے علماء پیدا ہونے کے اسباب و ذرائع کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے لو کلفت بصلة ما عرفت مسئلة (اگر مجھ کو پیاز کی تکلیف دی جاتی تو ایک مسئلہ کو بھی نہ پہچانتا)۔ ضروری ہے کہ علماء کو احتیاج اور افلاس سے نکالا جائے۔ ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی روزی اپنے قوت بازو سے حاصل کرسکیں تاکہ ان میں فارغ البالی، خودداری، آزادئ رائے پیدا ہوسکے اور ''چہ خورد بامداد فرزندم'' سے فی الجملہ آزاد ہوجائیں۔ یہ امر مشکل نہیں ہے مگر اس کے لیے متفقہ قومی آواز کی ضرورت ہے۔ مسلم تعلیمی کانفرنس کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ مجھ کو قوی امید ہے کہ پوری مسلم قوم اس مسئلہ میں کانفرنس کا ساتھ دے گی۔ میں فی الحال حسب ذیل تجاویز عربی تعلیم یافتوں کے لیے پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں:

(۱) کچھ کچھ معتد بہ وظائف ان طلبہ کے لیے مقرر کیے جائیں جو عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انگریزی پڑھنا چاہیں اور علی ہذا القیاس انگریزی مدارس کے ان فارغ شدہ طلبہ کے لیے بھی جو عربی پڑھنا چاہیں ان کے لیے بھی وہ وظائف امداد یہ جاری کیے جائیں۔

(۲) جس طرح مولوی فاضل وغیرہ کے سند یافتہ صرف زبان انگریزی میں گورنمنٹی امتحانات میں شرکت حاصل کرکے کامیابی حاصل کرسکتے ہیں، اسی طرح مسلم یونیورسٹی اپنے یہاں ایسے قوانین بنائے جن کی رو سے عربی مدارس کے فارغ شدہ طلبہ صرف انگریزی زبان کے امتحان میں شامل ہوسکیں۔ ان کے لیے تعلیم کا مستند انتظام کیا جائے کہ ایف اے کے بعد وہ بی اے کا امتحان دے سکیں۔

(۳) عربی مدارس کے طلبہ کے لیے ریلوے وغیرہ سے وہ تمام مراعات ملنی چاہئیں جو انگریزی مدارس کے طلبہ یا ایڈ گرفتہ مدارس کے طلبہ کو ملتی ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس مستند مدارس عربیہ

کی ایک فہرست تیار کرے جس کو گورنمنٹ بھی تسلیم کرے۔

(۴) قانون کے امتحانوں میں انگریزی زبان دانی کی شرط نہ رکھی جائے۔امتحانات ملکی زبانوں میں ہوں،علمی استعداد شرط کی جائے مگر ہسبِ مراتب جن امتحانوں کے لیے میٹرک، انڈر گریجویٹ یا گریجویٹ کی شرط ہے وہ رکھی جائے،اور اسی درجہ کے عربی استادوں کو بھی کافی سمجھا جائے۔عربی نصاب میں اس کے لیے مدارج قائم ہو سکتے ہیں اور بعض ضروری چیزوں کا نصاب میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔

(۵) کورٹ کی لینگوئج بدل دی جائے۔اگر فوراً ہائی کورٹ کی زبان بدلی نہ جاسکے تو وہ انگریزی ہی رہنے دی جائے لیکن دوسری تمام کورٹوں کی زبان لازمی طور پر بدل دی جائے۔

(۶) رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں عربی کی اسناد کو بھی ملازمت کے لیے کافی سمجھا جائے۔

(۷) اوقاف کے تمام ذمہ دار عہدوں کے لیے عربی اور مذہبی تعلیم کی تکمیل کو ضروری سمجھا جائے اور شرط کردی جائے۔

(۸) محکمہ منصفی اور ججی (صدارتِ اعلیٰ) کے لیے جس میں اکثر قضاء شرعی اور تقسیم وراثت وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے،مذہبی تعلیم کی سند ضروری قرار دی جائے۔

(۹) مسلمانوں کو محکمۂ قضاء حسبِ طلب عطا کیا جائے جس کا مطالبہ عرصہ دراز سے مسلمان کررہے ہیں۔

(۱۰) آرٹ اور صنعت کی تعلیم میں عربی تعلیم کے سند یافتوں کو شرکت کا موقع دیا جائے۔

(۱۱) محکمہ ہائے انہار،زراعت،تجارت کی تعلیمات میں عربی تعلیم یافتوں کو شریک کیا جائے۔

(۱۲) یونیورسٹیوں کے وہ طلبہ جو عربی پڑھتے ہیں،تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے کسی عربی دینی مدرسہ میں جاکر قیام کریں اور عربی کی اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کریں۔

محترم حضرات! میں نہایت عدیم الفرصت اور بہت ہی کم مایہ ہوں، بہت کم فرصت میں نہایت جلدی کے ساتھ قلم بند کرکے اپنے مختلف پریشان خیالات کو آپ حضرات کی بارگاہ میں پیش کررہا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اپنی نظر عفو کرم کو کام میں لاکر اگر کوئی چیز خلاف رائے یا باعث تکدر ہوئی ہو اس سے سماح فرمائیں گے۔'' (بشکریہ روزنامہ اوصاف)

حضرت مدنیؒ کے موقف کی تائید، مزید وضاحت اور عصری تطبیق کے حوالے سے

البرہان کی چند گزارشات

فضلائے مدارس کے روزگار کی فکر ''دنیاداری'' نہیں

ہم حضرت مدنیؒ کے موقف کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور اس سے اعراض مناسب نہیں۔ ایک عام مسلمان فرد کے لیے بھی اپنی معاش کی فکر کرنا اور اس کے لیے منصوبہ بندی کرنا اور جدوجہد کرنا ضروری اور مستحسن ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا رجحان نبی کریم ﷺ کے فقر اختیاری اور کارِ نبوت کی مصروفیات کی وجہ سے معاشی جدوجہد نہ کر سکنے اور بعض صوفیاء کے طرزِ عمل کی بناء پر اس کے برعکس بھی ہے لیکن ہمارے علم کی حد تک جمہور کی رائے میں یہ ایک کمزور موقف ہے کیونکہ صحیح احادیث میں نبی کریم ﷺ نے معاشی جدوجہد کی مصروفیت کو ''عین دینی کام اور جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔'' صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ وہ کسبِ رزق سے تساہل کو روا نہ گردانتے تھے اور سوال کرنے کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔ خصوصاً شیخینؓ کا طرزِ عمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ پر خلافت کی ذمہ داری ڈال دی گئی تو اس کے باوجود آپ دوسرے دن تجارت کے لیے بازار پہنچ گئے تو صحابہ کرام نے انہیں منع کیا اور بقدر ضرورت ان کی تنخواہ مقرر کی تاکہ وہ معاشی سرگرمی سے باز رہیں اور سارا وقت خلافت کے کاموں کو دے سکیں۔ حضرت عمرؓ کا وہ جملہ تو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور زبان زدِ عام ہے کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی بھوک سے مرتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ یہ ولی الامر اور راعی کی ذمہ داری ہے اور علماء کرام جانتے ہیں کہ اولی الامر اور راعی میں صرف حکمران ہی شامل نہیں بلکہ قبیلوں کے شیوخ، خاندانوں اور اداروں کے سربراہ اور علماء کرام بھی اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا ہماری رائے میں وفاقوں کے قائدین اور دینی مدارس کے مہتمم حضرات کی یہ اخلاقی اور شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے روزگار کے بارے میں سوچیں۔ یہ ہرگز ''دنیاداری'' اور غیر مرغوب و غیر مطلوب یا مکروہ سعی نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے مخاطب علماء کرام ہیں اس لیے ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے اور ان اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲- حکومت پہ انحصار مناسب نہیں

دوسری اہم اصولی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے اولی الامر ہونے کی حیثیت سے بلاشبہ یہ ذمہ داری براہ راست حکومت پاکستان کی ہے لیکن زمینی حقائق کا تقاضا ہے کہ اس کام کے لیے حکومتوں پر انحصار نہ کیا جائے اور مدارس اور ان کے وفاق خود اس معاملے پر غور کر کے اقدامات کریں۔اس کے دو بڑے سبب ہیں:

ایک تو یہ کہ پاکستان اگرچہ دارالاسلام ہے اور ہمارے دستور کی بہت سی دفعات مطابقِ اسلام ہیں لیکن عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے حکمران انگریزوں کا طرزِ حکمرانی ہی اپنائے ہوئے ہیں۔ معاشرے اور ریاست کے مختلف شعبوں خصوصاً نظام تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے انہوں نے ۶۹ سال گزرنے کے باوجود کچھ نہیں کیا اور نہ آئندہ ان سے اس کی توقع ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ گورے انگریزوں کی جگہ اب کالے انگریز ہمارے حکمران ہیں جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔اور ہم بظاہر آزاد ہو گئے ہیں لیکن ہمارے یہ حکمران فکری طور پر اب بھی مغرب اور اس کی فکر و تہذیب کے غلام ہیں اور مغربی طاقتوں کی سرپرستی کی وجہ سے اسلام اور اسلامی جمہوریت کا نام استعمال کرنے کے باوجود عملاً فرنگی نظام حکومت ہی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اندریں حالات ہماری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس اور ان کے وفاق یہ سمجھتے ہوئے اقدامات کریں کہ حکومت اس معاملے میں ان کا ساتھ نہیں دے گی اور کچھ نہیں کرے گی (اگرچہ ان سے مطالبہ کرنا چاہیے اور پوری قوت سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے آئندہ سطور میں ہم ان شاءاللہ کچھ تجاویز بھی پیش کریں گے)۔

دوسرے یہ کہ ہماری علمی، تعلیمی اور تہذیبی روایت بھی یہی ہے کہ یہ کام علماء کرام کریں اور پرائیویٹ سیکٹر میں عوام کے تعاون سے کریں اور اس کے لیے حکومت پر تکیہ نہ کریں۔ تفصیل اس مر کی یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کے بعد امت کے اہل علم و صلاح نے یہ فیصلہ کیا جس پر علماء امت کا عملاً اجماع ہو گیا کہ انہوں نے حکومت و سیادت سے صرف نظر کرتے ہوئے تعلیم و تزکیہ کا میدان سنبھال لیا اور مساجد و مدارس اور رباط اور زاویے ان کے مرکز نگاہ بن گئے۔ اسی طرح فقہ و افتاء کا کام بھی مغربی استعمار کے استیلاء سے پہلے بارہ سو سال تک علماء کرام کے ہاتھوں میں پرائیویٹ سیکٹر میں رہا ہے۔ علماء اور معاشرے کی اس اجتماعی

دانش کی مثال کہ انہوں نے تعلیم وفقہ کا کام حکومتوں کے ہاتھوں میں نہیں جانے دیا، اپنی نوعیت کی ایک منفرد مثال ہے اور اس کے انتہائی خوشگوار اثرات ملتِ اسلامیہ پر مرتب ہوئے ہیں۔

برصغیر میں بھی مسلم حکمرانوں کے دور میں تعلیم علماء کرام کے ہاتھوں میں رہی۔ جب مسلم حکومت ختم ہوگئی اور انگریز نے مسلم اوقاف پر قبضہ کرلیا تو علماء نے مٹی کے حجروں اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر، توکل علی اللہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا کام شروع کر دیا اور ان مدارس کا بوجھ مسلم معاشرے نے اٹھا لیا۔ تاہم اس وجہ سے کہ علماء کرام انگریز حکومت کے لیے کارکن تیار نہ کرنا چاہتے تھے اور ان کے پیش نظر صرف مسلم معاشرے کا تحفظ تھا، انہوں نے دنیوی علوم کی تدریس بند کر دی۔ یہ صورتِ حال قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہی اور علماء کرام عوام کے تعاون سے دینی مدارس کی روایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

لہٰذا دینی مدارس کو اپنے فضلاء کے روزگار کے سلسلے میں خود منصوبہ بندی کر کے اس پر عمل درآمد کرنا چاہیے اور اس کے لیے حکومت پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ دینی مدارس اور وفاق اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں، اس حوالے سے ہماری بعض تجاویز درج ذیل ہیں۔

دینی مدارس اور وفاقوں کے لیے راہِ عمل

۱- اس ضمن میں سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ دینی مدارس اور ان کے وفاق اپنے مقصد تعلیم پر نظر ثانی کریں اور اس روایتی فکر کو بدلیں کہ ان کا کام صرف مدارس ومساجد کے لیے افراد تیار کرنا ہے۔ یہ ایک عظیم مقصد تھا جسے علماء کرام نے دورِ غلامی میں بھی کامیابی سے حاصل کیا اور آج بھی مدارس ومساجد ان دینی مدارس کی سعی ہی سے آباد ہیں۔ **فجزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء** لیکن پاکستان بننے کے بعد اب یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور شرعی طور پر دارالاسلام اور اسلامی مملکت ہے اور علماء کرام اور ان کی دینی جماعتیں اس معاشرے اور ملک کو سچا اسلامی معاشرہ اور مثالی اسلامی مملکت بنانے کے لیے جدوجہد بھی کر رہی ہیں۔

اس پس منظر میں اب دینی مدارس کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو نہ صرف مساجد و مدارس کو آباد رکھیں بلکہ معاشرے اور ریاست کے اداروں کے لیے بھی بہترین کارکن ثابت ہوں۔ وہاں وہ اسلامی اخلاق اور سلوک کا مظاہرہ کریں اور معاشرے وریاست اور

ان کے اداروں کو سیکولر جدید ذہن کے افراد کے سہارے پر چھوڑنے کی بجائے خود اسے اسلامی کردار کے ساتھ اور اسلامی تناظر میں چلانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان شاء اللہ اس کے بہت سے مثبت اور مفید اثرات اس ملک اور معاشرے پر پڑیں گے اور اس کے لیے علماء کرام عنداللہ بھی ماجور ہوں گے۔

۲- اگر مذکورہ بالا مقصد حاصل کرنا ہو تو دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کو موجودہ نصاب اور نظام پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا تعلق رائے اور تدبیر سے ہے (اور اگر شرعی اصطلاحات استعمال کریں تو اجتہاد اور سیاسہ شرعیہ سے ہے) اور اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ ہم بطور تجویز ایک نقشہ اور منصوبہ دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کے سامنے غور وفکر کے لیے پیش کرتے ہیں:

i- مدارس کا موجودہ ڈھانچہ یہ ہے کہ وہ آٹھ سال میں ثانویہ عامہ، خاصہ، عالیہ اور عالمیہ کرواتے ہیں۔ بعض مدارس ابتدائیہ ومتوسطہ (یعنی پرائمری و مڈل) بھی کرواتے ہیں لیکن یہ بہت کم ہیں البتہ بہت سے مدارس تحفیظ القرآن کا اہتمام کرتے ہیں اور بعض تجوید کا بھی جب کہ ناظرہ قرآن کی ذمہ داری مساجد نے سنبھالی ہوئی ہے۔ عالمیہ کے بعد بعض بڑے مدارس میں چھ ماہ سے لے کر دو سال تک کے تخصص کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اس نظام پر نظر ثانی کرتے ہوئے ہماری رائے یہ ہے کہ اسے مندرجہ ذیل شکل دی جائے:

ii- ابتدائیہ (چھ سال) اور متوسطہ (تین سال) یعنی پرائمری اور مڈل سطح تک سکول کی تعلیم کو دینی مدارس اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ حکومتی نصاب میں اپنی طرف سے دینی مواد کا اضافہ کریں اور بچوں کی اسلامی لحاظ سے ذہن سازی اور تربیت کریں۔ یاد رہے تزکیہ وتربیت کے لحاظ سے عمر کا یہ حصہ سب سے زیادہ اہم اور قیمتی ہوتا ہے اور اس میں بچے کی شخصیت بنتی ہے۔ دینی مدارس اگر اس مرحلے کی تعلیم کو کنٹرول کر لیں اور مسلمان بچے کی صحیح اور متوازن تربیت کر دیں تو سمجھیے انہوں نے آدھی جنگ جیت لی۔

iii- باقی کے مراحل تعلیم میں چار سالہ ثانویہ (عامہ وخاصہ یا میٹرک وایف اے)، چار سالہ گریجوایشن (عالیہ وعالمیہ یا بی ایس یا بی اے ایم اے) اور دو سالہ ماسٹرز (ایم فل) اور چار سالہ پی ایچ ڈی شامل ہیں۔ یہ ۲۲، ۲۳ سالہ دورانیہ خاصا طویل ہے اور اس میں بہت کچھ ہوسکتا

ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس طلبہ کے دو گروپ بنالیں۔ ایک علوم اسلامیہ میں تخصص یعنی ماہر علماء تیار کرنے کا اور دوسرا عمرانی علوم وسائنسی علوم کے طلبہ کا۔ بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ ترجیحاً عمرانی علوم کے طلبہ کو سنبھال لیں کیونکہ عمرانی علوم افراد کی ذہن سازی اور تربیت میں مقابلتاً زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں (اگرچہ سائنسی وفنی علوم کی اہمیت بھی اپنی جگہ ہے لیکن نظریاتی لحاظ سے ان کی اہمیت نسبتاً کم ہے اور ان کے انتظامی اخراجات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں)۔ اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ دینی و دنیاوی تعلیم کی تفریق ختم کر دی جائے اور ایک ہی موحّد (Integrated) نظام تعلیم ہو جس میں پرائمری ومتوسطہ میں بنیادی دینی تعلیم (الدین بالضرورۃ) ہر مسلمان طالب علم کو دے دی جائے اور عصری علوم ومہارتوں کی بنیاد بھی رکھ دی جائے۔ پھر مرحلہ ثانویہ میں تخصص کی ابتداء کر دی جائے اور دینی مدارس علوم دینیہ کے علاوہ عمرانی علوم (اور بعض مالی طور پر مضبوط دینی مدارس اگر ہو سکے تو سائنس گروپ) کے طلبہ کو بھی داخلہ دیں۔ ان مراحل میں تعلیم Inter Disciplinary ہونی چاہیے یعنی دینی علوم کے طلبہ عمرانی وسائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ بھی کریں اور عمرانی وسائنسی علوم کے طلبہ نہ صرف منتخب دینی علوم کا مطالعہ کریں بلکہ ان کے تخصصات کا مواد (Content) بھی اسلامی تناظر میں مدوّن کیا جائے۔ یہ کام اگر حکومت نہ کرے تو دینی مدارس کے وفاق مل کر (علماء اور ماہرین تعلیم کو یکجا بٹھا کر) خود کریں۔ اس کے لیے جدید نظام تعلیم میں گنجائش موجود ہے اور دینی مدارس نصابی کتب کی اپنی سریز وجود میں لا سکتے ہیں اور حکومتی نصاب کی ضروریات کو مدِّنظر رکھنے کے ساتھ اس میں ضروری دینی ونظریاتی مواد کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔

یہی کام گریجوایشن اور ایم اے کی سطح پر کیا جائے۔ یہاں علومِ اسلامیہ کے تخصص میں نہ صرف بین التخصصات استفادہ (Inter Disciplinary Touch) موجود ہو بلکہ دینی علوم کو عصری تناظر میں اور تقابلی مطالعے کے ساتھ پڑھایا جائے مثلاً آپ نے عالمیہ میں اسلام کا معاشی نظام پڑھانا ہے تو 'مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام'، 'اسلام اور سرمایہ داری میں تقابلی مطالعہ' اور 'پاکستان کے معاشی مسائل' بھی دینی مدارس کے اس نصاب اور کورس کا حصہ ہونے چاہئیں۔ اسی طرح ایک دینی مدرسہ اگر سماجی علوم میں ایم اے اکنامکس کی ڈگری دے رہا ہے تو اس میں جدید اکنامکس پر ترکیز کے ساتھ ساتھ اسلام کا معاشی نظام، جدید معاشی مسائل کا اسلامی حل اور سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں تقابلی مطالعہ بھی اس کا جزو ہونا چاہیے۔

iv) دینی مدارس ان اصلاحات کے بعد اگر کوشش کریں تو ان شاءاللہ ان کی ڈگریاں آسانی سے حکومتی ڈگریوں کے مساوی قرار دی جائیں گی۔ یا بامر مجبور وقتی طور پر وہ حکومتی ڈگری ہی دلوا دیں لیکن نصاب تعلیم وہی ہو جس کا ہم نے ذکر کیا ہے تو بھی مطلوبہ فوائد حاصل ہو جائیں گے۔ دریں اثناء دینی مدارس کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کی متبادل ڈگریوں کے نام بھی وضع کر لینے چاہئیں جیسے عالیہ بی اے کے برابر اور عالمیہ ایم اے کے برابر ہے اسی طرح اہم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی مدارس کی ڈگریوں کے اپنے نام ہونے چاہئیں جیسے درجہ فضیلت یا علامہ وغیرہ۔

فوائد

اس تجویز پر عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ:

۱- دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ نہ صرف مساجد میں بطورِ امام وخطیب کام کر سکیں گے اور دینی مدارس میں بطورِ استاد پڑھا سکیں گے بلکہ وہ نجی اور سرکاری دفاتر میں بھی کام کر سکیں گے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھا سکیں گے اور تجارت وصنعت وحرفت میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر بطور منتظم یا مالک کام کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں گے۔

۲- اس سے ملک کی معاشرتی ومعاشی زندگی میں علماء کرام کو زیادہ بہتر، متوازن اور موثر کردار ادا کرنے کا موقع ملے گا جس کے دینی لحاظ سے بہت مفید اور خوشگوار اثرات ظاہر ہوں گے، ان شاءاللہ۔

۳- اس سے معاشرے میں دین ودنیا کی تفریق ختم ہوگی جو اپنی اصل میں غیر اسلامی ہے اور مغرب کے سیکولرزم کو اس سے سپورٹ ملتی ہے۔

۴- عملی زندگی میں شرکت اور عام لوگوں کے ساتھ معاملات کے نتیجے میں علماء کرام میں وسعت نظر پیدا ہوگی، وہ معاشرے کو پہلے سے بہتر انداز میں سمجھنے کے قابل ہوں گے اور لوگوں کے مسائل کو بہتر انداز میں سمجھ کر ان کے شرعی حل پیش کر سکیں گے۔

۵- دینی مدارس کے فضلاء کے لیے روزگار کے وسیع مواقع پیدا ہوں گے تو لوگوں کا رجحان ان مدارس کی طرف اور زیادہ ہوگا اور ان کی نظر میں دینی مدارس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت مزید بڑھے گی جس سے مدارس ترقی کریں گے اور مزید پھلے پھولیں گے۔

۶- اس سے معاشرے میں اتحاد واتفاق اور یکجہتی وہم آہنگی بڑھے گی اور عام لوگ دین کے زیادہ قریب آئیں گے۔

حکومت سے مطالبات

دینی مدارس کے نظام میں رضا کارانہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے وفاقوں کو حکومت کے ساتھ ٹھوس ایجنڈے کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات کرنے چاہئیں تاکہ حکومت:

۱- دینی مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کرے

۲- انہیں مالی معاونت مہیا کرے

۳- سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کی اصلاح کرے اور ان میں اسلامی لحاظ سے وہ تبدیلیاں لائے جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر دینی مدارس کے وفاق مل کر اپنے اندر اصلاحات لائیں اور حکومت کے سامنے مندرجہ بالا معاملات رکھیں تو ان شاء اللہ انہیں کامیابی ملے گی۔ اس کے لیے علماء کرام، ماہرین تعلیم اور حکومتی نمائندوں پر مشتمل کمیٹی یا کمشن تشکیل دیا جاسکتا ہے تاکہ ان اصلاحات پر عمل درآمد کیا جاسکے اور کام کی نگرانی کی جاسکے تاکہ اس مشق کے موثر نتائج نکل سکیں۔ مجوزہ کمیٹی میں نامور علماء کی اکثریت ہونی چاہیے۔

عجیب صورت حال ہے۔ مولوی صاحبان لڑ رہے ہیں۔ جاہل دین سکھا رہے ہیں۔ پاپ اسٹار تبلیغ کر رہے ہیں۔ کھلاڑی سیاست کر رہے ہیں۔ ماڈل سمگلنگ اور سمگلر عمرے کر رہے ہیں۔ فوج ملک چلا رہی ہے۔ سیاستدان کاروبار کر رہے ہیں اور عوام سو رہے ہیں۔ پتہ نہیں اس اندھیری رات کی سحر کب ہوگی؟

تعلیم و تربیت

عاصم حفیظ

اردو میں قرآن وحدیث کا پہلا سرچ انجن

مارشل میلکو ہن میڈیا تھیوری کے حوالے سے ایک اہم ترین نام ہے۔اس نے پچاس سال قبل نظریہ پیش کیا تھا کہ Medium is the Message یعنی ذریعہ ابلاغ ہی سب سے طاقتور پیغام ہوتا ہے۔اس کی یہ تھیوری بہت مشہور ہوئی اور دنیا پر حاکمیت کا ذہن رکھنے والی مغربی طاقتوں نے اسے بھرپور طریقے سے استعمال بھی کیا۔ایسی ٹیکنالوجیز ایجاد کی گئیں جن کا مقصد دنیا بھر کے لوگوں کو مغربی طرز فکر کا پیروکار بنانا تھا۔سامراجی ذہن رکھنے والے سیکولر طبقات کی کوشش تھی کہ لوگوں کو اور خاص کر نوجوان نسل کو ٹیکنالوجی کے ذریعے ایسے مشاغل میں مصروف کر دیا جائے کہ وہ اپنے نظریات، دین وثقافت سمیت سب کچھ بھلا کر صرف ان آلات کے غلام بن کر رہ جائیں۔ مغربی طاقتیں اسی سوچ کے تحت کمیونزم اور بہت سے دیگر نظریات کو شکست دینے میں کامیاب بھی رہیں۔دنیا بھر میں اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کو قابو کرنے کے لئے بھی ٹیکنالوجی کا سہارا لیا جانے لگا۔ایک طرف میڈیا ٹیکنالوجی کے ذریعے اسلام مخالف پروپیگنڈے کو پھیلایا گیا تو دوسری جانب ایسے آلات اور ٹیکنالوجی کو بھی پروموٹ کیا گیا جس کا مقصد نوجوان نسل کو انتہائی غیر محسوس انداز میں اسلامی علوم وروایات سے دور کرنا تھا۔یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ اور موبائل فون کے بہت سے آلات مغربی دنیا میں تو ابھی تک کافی مہنگے ہیں لیکن مسلم ممالک کو یہ انتہائی کم قیمت میں مہیا کئے جا رہے ہیں۔ان سب کوششوں کا مقصد ایک عالمی معاشرے کا قیام تھا جس میں کسی بھی مذہب ونظریے کی کوئی گنجائش نہ ہو اور اسلام کی تو بالکل بھی نہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔تصویر کا دوسرا رخ اللہ تعالی کے مسلمانوں پر انعامات اور قرآن و حدیث کی حفاظت کا وعدہ ہے۔آپ اسے معجزہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہر مشکل ترین دور میں اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کئے اور ایسے افراد سامنے آئے کہ جنہوں نے اس دور کے تقاضوں کے عین مطابق اسلام کی تبلیغ واشاعت کا بیڑا اٹھایا۔الحمدللہ! آج دنیا بھر میں اسلام سب سے زیادہ تیزی

☆ لیکچرر جرنلزم 0321-7165256

سے پھیلنے والا مذہب ہے اور آج وہی ٹیکنالوجی جو اہل اسلام کو دین سے دور کرنے کے لئے ایجاد کی گئی تھی وہی اسلام کی تبلیغ واشاعت کا بہترین ذریعہ بن چکی ہے۔ قارئین! یہ ساری تمہید میں نے آپ کو ایک ایسے ہی باہمت، روشن ذہن اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے قرآن وحدیث کی اشاعت میں مصروف عمل نوجوان محترم زاہد حسین کا تعارف کرانے کے لئے باندھی ہے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے زاہد حسین کی قرآن پاک کی ریسرچ کے حوالے سے موبائیل اور کمپیوٹر سافٹ وئیر تیار کرنے کی کہانی سنیں تو میری طرح آپ بھی ضرور حیران ہو جائیں گے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اس نوجوان کی قرآن پاک سے محبت اور اس کی جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے اشاعت کا جذبہ قابل دید ہے۔ سالوں کی محنت سے یہ سافٹ وئیر بنا ہے جس کے استعمال سے آپ قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھ سکتے ہیں، اس کے موضوعات تلاش کر سکتے ہیں، اپنی مرضی کی آیات کا ترجمہ وتشریح جان سکتے ہیں، نامور قراء کرام کی دلکش آوازوں میں تلاوت سن سکتے ہیں، تفاسیر کا مطالعہ کر سکتے ہیں، حتی کہ آواز کے ذریعے بول کر تحقیق وتلاش کر سکتے ہیں۔ غرض اس سافٹ وئیر اور موبائل ایپلیکیشن میں اتنا کچھ ہے جو آپ کو حیران کرنے کے لئے کافی ہوگا اور آپ کئی بار بلند آواز میں ماشاءاللہ ضرور پڑھیں گے۔

زاہد حسین کا قرآن پاک کے حوالے سے کام جتنا عمدہ اور بے مثال ہے اسی طرح وہ ایک انتہائی ملنسار انسان بھی ہیں۔ ان کی عزم وہمت کی داستان انتہائی دلچسپ ہے۔ صوبہ سندھ کے شہر حیدرآباد کی سبزی منڈی میں ایک مزدور کی حیثیت سے کیریئر کا آغاز کیا۔ مالکان نے کمپیوٹر شارٹ کورس کرایا تو زاہد حسین کا دل اس نئی ٹیکنالوجی میں لگ گیا۔ خوب محنت کی، کئی شارٹ کورسز اور پیشہ ورانہ سرٹیفکیٹ حاصل کئے۔ کمپیوٹر میں مہارت ہوئی تو دل میں خدمت قرآن کے جذبے نے جوش مارا۔ برطانیہ کے جمال الناصر کے قرآنک سرچ انجن میں اردو دان طبقہ کے لئے کوئی خاص سہولت نہ ہونے کے باعث زاہد حسین نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ ایک ماہر کمپیوٹر انجینئر ہونے کے باوجود بذات خود پورے قرآن پاک کے ترجمے کو رومن اردو میں کمپوز کیا۔ سن ۲۰۰۸ء میں وہ سرچ قرآن سافٹ وئیر پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک، سمیت کئی عالمی مسلم علمائے کرام وسکالرز نے ان کے کام کو سراہا ہے۔ سابق آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور بہت سی نامور شخصیات انہیں مدعو کر کے اس شاندار کارنامے پر تعریفی سرٹیفکیٹس سے نواز چکی ہیں جبکہ ملک کے معروف اخبارات وٹی وی چینلز پر ان کے انٹرویوز بھی نشر ہو چکے ہیں۔۔ قرآن سرچ

کے ابتدائی سافٹ ویئر کے بعد انہوں نے اس کو مزید بہتر کرنے کے حوالے سے کاوشیں جاری رکھیں۔انہوں نے اس میں تفاسیر، تراجم، تلاوت، موضوعات کی سرچ اور دیگر کئی سہولیات فراہم کردی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے احادیث مبارکہ کی سرچ اور موضوعات کی تلاش کے حوالے سے بھی سافٹ ویئر اور کمپیوٹر اپلیکیشن تیار کی ہے۔زاہد حسین اب آواز کے ذریعے قرآن اور احادیث سرچ کرنے کے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔زاہد حسین کی لگن صرف ایک ہی ہے کہ قرآن فہمی انتہائی آسانی سے ہر اس شخص کی پہنچ میں ہو جائے جو اس کتاب ہدایت سے رہنمائی لینا چاہتا ہے۔زاہد حسین جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کی کاوشیں ان سیکولر قوتوں اور معاشرے میں لادینیت پھیلانے کے لئے سرگرم حلقوں کے لئے ایک واضح پیغام ہے کہ انشاءاللہ قرآن فہمی اور اس کی تبلیغ واشاعت کو کبھی بھی زوال نہیں آسکتا۔یہ کتاب ہدایت ہر دور کے لئے اور ہر انسان کے لئے ہے۔زاہد حسین کی لگن اور قرآن فہمی کے لئے انتھک محنت کا صلہ تو ذات باری تعالیٰ ہی دے سکتی ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس باہمت نوجوان کو مزید توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ دین حنیف کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔زاہد حسین صاحب کی ویب کا لنک ہے: www.nuzool.com

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام..... پتہ.....

.....فون.....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تعلیم و تربیت مدیر

سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

تبلیغی بھائیوں کی سادہ لوحی

ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ان کے ہاں (لاہور کی ایک پوش آبادی) کے کھاتے پیتے فعال تبلیغی بھائیوں نے اپنے بچے اپچی سن اور لاہور گرامر وغیرہ میں داخل کرا رکھے ہیں۔ہم نے انہیں اس پر متنبہ کرنے کی کوشش کی تو جواب میں کہنے لگے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟

ہمیں یہ سن کر دکھ ہوا۔اپنوں کی سادگی کا یہ عالم ہے، ادھر غیروں کی عیاری کا یہ عالم ہے کہ سات سمندر پار بیٹھے اپنی الحادی فکر اور اپنی بے خدا تہذیب کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے اور دوسروں کے نظام تعلیم کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں اور کروڑوں، اربوں ڈالر انہوں نے اس کے لیے مختص کر رکھے ہیں.....اور ہم اتنے سادہ لوح ہیں کہ ان کی پیروی میں کوئی حرج ہی نہیں سمجھتے۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے ایک مرد دانا نے کہا تھا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور یہ کہ ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ سین دکھائے گا کیا رنگ
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اب پردہ اٹھ چکا ہے۔قوم کے اخلاق کی حالت اس کی گواہ ہے؟ قصور کا جنسی سکینڈل، تین تین سال کی بچیوں کے ساتھ درندگی۔ رشوت، فراڈ، بھتہ خوری، سیاستدانوں اور سول و فوجی بیوروکریسی کی اربوں کی کرپشن، غیر ملکی اکاؤنٹس.....کس کس چیز کا رونا روئیں۔کیا اس کی وجہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے کہ ہم نے انگریز کا نظام تعلیم جاری رکھا اور اسلامی تعلیمات کے مطابق تعمیر فرد، انسان سازی اور کردار سازی کو کوئی توجہ اور اہمیت نہیں دی؟ یہ انتہائی سادہ لوحی ہے کہ یہ کہا

جائے کہ ہم نے تو نماز ہی پڑھنی اور تبلیغ ہی کرنی ہے خواہ حکومت مسلمانوں کی ہو یا کافروں کی! کیونکہ اگر دین محض نماز روزے اور تبلیغ کا نام ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو ریاست قائم کرنے اور چلانے اور غلبۂ دین واعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کی کیا ضرورت تھی؟ اور اقبال کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ؎

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

بلاشبہ نماز روزہ اور تبلیغ دین میں بہت بنیادی اہمیت رکھتے ہیں لیکن کیا دین بس اتنا ہی ہے؟ اور کیا کوئی عالم دین اس کا جواب اثبات میں دے سکتا ہے؟ **فافھم**

مغربی تہذیب کے مظاہر سے نفرت

ہمیں ایک دوست نے توجہ دلائی کہ آپ کالر والی قمیص پہنتے ہیں اور علماء کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ کسی نے آپ کو ٹوکا نہیں؟ ہم نے کہا 'نہیں! اس میں ایسی کیا بات ہے؟' وہ کہنے لگے بہت سے علماء کرام، خصوصاً دیوبندی علماء، اسے صلیب کا مظہر سمجھ کر اس سے نفرت کرتے ہیں ہم نے کہا: یہ نصیب! اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے۔ ہم پچھلے تیس سال سے مغربی فکر وتہذیب کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھ لکھ کر باؤلے ہوئے جا رہے ہیں اور ہمیں پتہ ہی نہیں کہ مغربی تہذیب سے اتنی نفرت کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ اے مہربانو! کہاں چھپے ہوئے ہو؟ اگر تم مغربی فکر وتہذیب سے اتنی نفرت کرتے ہو تو تمہارے دینی مدارس کے نصاب میں اس فکر وتہذیب کے خلاف ایک لفظ بھی کیوں موجود نہیں؟ اس الحادی فکر وتہذیب کو سمجھنے کے لیے، اسے علمی سطح پر رد کرنے کے لیے اور عوام کو اس کے زہر سے بچانے کے لیے تمہارے ہاں کیا انتظام ہے؟ تمہارے علماء نے معمولی تبدیلیوں سے مغرب کی لادین جمہوریت کو کیوں قبول کر لیا؟ اس کے سرمایہ دارانہ نظام کو کیوں برداشت کر لیا؟ کروڑوں مسلمان بچے ہر سال مغرب زدہ تعلیم پا کر اسلام اور اخلاق سے دور ہو رہے ہیں، تم نے اس کی اصلاح کی کیا کوشش کی؟ تمہاری مغربی فکر وتہذیب سے اس نفرت کو سلام! لیکن یہ کیسا جذبہ ہے جو گونگا ہے! یہ کیسی بہار ہے جو رنگ ونور سے تہی ہے۔ یہ کیسا طوفان ہے جو برائی کو جڑ سے نہیں اکھاڑتا! کچھ تو سوچو!

میڈیا

عاصم حفیظ ☆

پاکستانی میڈیا کی ابلیسیت
ٹافی، قلفی اور بوتل کی قیمت میں لڑکیاں

پاکستانی میڈیا اس لحاظ دنیا بھر میں منفرد مقام رکھتا ہے کہ یہ مادر پدر آزاد ہے اور اس پر جس کا جو دل چاہے دکھا سکتا ہے۔ کوئی روک ٹوک یا قاعدہ قانون نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس ملک میں کسی بھی قسم کے طور طریقے، رسم و رواج اور سماجی و ثقافتی روایات سرے سے موجود ہی نہیں۔ نیز میڈیا کے حوالے سے کسی قسم کے قواعد وضوابط کی بات کرنا یہاں دقیانوسیت اور روشن خیالی پر بھیانک حملہ قرار دیا جاتا ہے۔ میڈیا پر پیش کئے جانیوالے لباس اور مواد پر بحث کرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔ پاکستانی میڈیا پر پیش کئے جانے والے اشتہارات میں نوجوان لڑکیوں کو ایک خاص روپ میں دکھایا جاتا ہے جو انتہائی افسوسناک ہے۔ آپ کئی اشتہارات ایسے دیکھ سکتے ہیں جن میں لڑکیوں کو لالچی اور اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خاطر اپنا آپ قربان کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے سافٹ ڈرنک کے اشتہار میں دکھایا جاتا ہے کہ لڑکیاں ایک بوتل کی خاطر ایک سے دوسرے شخص کے پاس ماری ماری پھرتی ہیں۔ ایک قلفی کی ایڈ میں بھی لڑکی کو انتہائی للچائی نظروں سے قابل ترس حالت میں دکھایا جاتا ہے۔ اس طرح کی درجنوں بلکہ سینکڑوں مشہوریاں آپ ٹی وی چینلز پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا دکھایا جاتا ہے کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خاطر ایک لڑکی کسی سے متاثر ہو جاتی ہے حتیٰ کہ لڑکوں کی جانب سے اچھی بنی ہوئی شیو اور اپنے جسم کی بدبو کا اثر زائل کرنے کے لئے لگائے جانے والے باڈی سپرے جیسی چیزوں کی خاطر لڑکیوں کو کسی پر مرمٹتے دکھایا جاتا ہے۔ یہ کتنا بھیانک روپ ہے جس میں نوجوان لڑکیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس طرح کے اشتہارات کا ایک دوسرا رخ بھی ہے کہ بہت سے نوجوان لڑکے ان سے متاثر ہو کے اپنے اخراجات بے پناہ بڑھا لیتے ہیں۔ وہ بیچارے اشتہار میں دکھائے گئے ملبوسات پہن کر اور ہاتھ میں اسی طرح کی قلفیاں، ٹافیاں، چاکلیٹ اور بوتلیں پکڑ کر شوخیاں مارتے مارتے

☆ لیکچرر جرنلزم 0321-7165256

تھک جاتے ہیں لیکن ویسا کوئی بھی کرشمہ نہیں ہو پاتا جوانہوں نے ٹی وی میں دیکھا ہوتا ہے۔اس سے کسی اور کو فائدہ ہو نہ ہو مختلف قسم کے برانڈز والوں کو کافی فائدہ ہوجاتا ہے۔اس سے معاشرے میں بے راہ روی اور فحاشی وعریانی کے فروغ کے علاوہ دیکھا جائے تو یہ سب حقیقی دنیا سے کس قدر مختلف بھی تو ہے؟ کیا روشن خیال اور ماڈرن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کو لالچی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے گھٹیا سے گھٹیا انداز میں پیش کیا جائے۔ ہمارے ہاں خواتین کے حقوق اور معاشرے میں انہیں ''معزز مقام'' دلانے کے حوالے سے سیکڑوں این جی اوز سرگرم ہیں جو ہر چھوٹے بڑے معاملے میں چیختی چلاتی پائی جاتی ہیں۔ان سے گزارش ہے کہ میڈیا پر پیش کیا جانے والا خواتین کا یہ روپ کیا ان کی عزت وتوقیر میں کمی اور ان کے حقوق کی پامالی کے زمرے میں نہیں آتا؟ عورت کو معاشرے میں ''باعزت مقام'' دلانے کی دعویدار یہ روشن خیال بیگمات اس حوالے سے بات کیوں نہیں کرتیں کہ میڈیا پر انہیں اچھے انداز میں پیش کیا جائے؟ اسلام نے تو عورت کو باعزت مقام دیا تھا۔مغرب کی تقلید میں اختیار کی جانے والی روشن خیالی نے ہمارے معاشرے میں اسے شوپیس بنادیا ہے۔ اورآج کے پاکستان کی حقیقت یہی ہے کہ ہمارے میڈیا میں خواتین خصوصا نوجوان لڑکیوں کو لالچی اور چند ٹکے کی چیزوں کے لئے اپنا آپ قربان کرتے دکھایا جاتا ہے نہ کہ غیرت منداور باحیا مسلم خواتین کے طور پر۔

مدیر

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

قصور کا جنسی سکینڈل.....میڈیا نے آسمان پر اٹھا رکھا ہے۔حکمرانوں کے مذمتی بیانات، سیاست دانوں کی چیخ و پکار، اسمبلیوں میں توجہ دلاؤ نوٹس۔اخبارات کے اداریے، انتظامیہ کے کمشن، پولیس کے ہتھکنڈے.....خدا کے بندو! کوئی تو یہ سوچے کہ اس جنسی درندگی اور بہمیت کا ماحول کون پیدا کر رہا ہے؟ اس کا سب سے بڑا ذمہ دار یہی میڈیا تو ہے.....یہی حکمران تو ہیں جو مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت کو پروموٹ کر رہے ہیں.....اور اس کے ذمہ دار ہمارے مذہبی لیڈر اور ہماری مذہبی جماعتیں بھی تو ہیں جو یہ سب کچھ ہوتا بے حسی سے دیکھ رہی ہیں اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے کو تیار نہیں اور نہ معاشرے میں انسان سازی اور کردار سازی کو اپنی ترجیح بنانے کے لیے تیار ہیں۔کوئی ہے جو ان باتوں پر غور کرے؟

تزکیۂ نفس

ڈاکٹر انعام اللہ☆

'شیخ' کی تلاش؟
تزکیہ بالقرآن ہی واحد حل ہے

چند ماہ پیشتر زاہد اقبال صاحب (اسلام آباد) کے SMS کے جواب میں ہم نے البرہان (شمارہ مئی ۲۰۱۵ء) میں عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم بہترین مزکی و مربی ہے تاہم نفسی پیچیدگیوں کی وجہ سے بعض اوقات ایسے شخص کی ضرورت پڑ جاتی ہے جو ذاتی سطح پر فرد کی رہنمائی کر سکے۔ اب ڈاکٹر انعام اللہ صاحب کا یہ مضمون موصول ہوا ہے جن کا اصرار ہے کہ تزکیے کے لیے قرآن ہی کافی ہے (اور انہوں نے اس کا طریقہ کار بھی بتایا ہے) اور یہ کہ 'شیخ' سے استفادے کا راستہ پرخطر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات قابل غور ہے..... اور البرہان حسبِ روایت اس موضوع کے حق میں یا اس کے خلاف مضامین کا خیر مقدم کرے گا۔ مدیر

شیطان کبیر (ابلیس) اکا نسانوں کو گمراہ کرنے کا تجربہ ایک لاکھ سال سے زیادہ کا ہے۔ جینیاتی پیمانے (Genetic Maping) کے مطابق حضرت حوا کو آج سے تقریباً ایک لاکھ سال پہلے خالق کائنات نے تخلیق کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ 'شیطان کبیر' کم وبیش ایک ارب تماشے اور کھیل انسانوں کو ورغلانے کے لیے ایجاد کر چکا ہے۔ دنیا کے ہر پانچ چھ انسانوں کا گروہ اپنے کسی ایسے ہی مشغلے میں زندگی گنوا دیتا ہے۔ اس کا یہ کام 'نئی نیٹ نسل' کے نخوں کے لیے مزید آسان ہو گیا ہے۔ ایسے دور کے مصروف نوجوان کو اگر کسی سچے شیخ کی تلاش کا کام سونپ دیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور ان میں سے کتنے فیصد نوجوان اپنے مقصد کو پہنچ پائیں گے؟ راقم نے کسی زمانے میں ایسی ہی ایک مہم جوئی کا آغاز کیا۔ ملک کے طول وعرض میں مختلف الانواع صلاحیتوں کے مالک شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتی رہی۔ توجہ سے دلوں کو پھیرنے والے، خود اڑنے اور دوسروں کو اُڑانے والے، آسمانی سیر بلکہ ساتویں آسمان تک پہنچانے والوں سے لے کر پار لگانے والے بیوپاریوں اور کاروانِ ناجیہ کی لگام تھامے حضرات کا سامنا ہوا۔ جنوں اور پریوں کو قابو میں

☆ ڈاکٹر زلین، دارالسلام کالونی، اٹک

کر دینے والے تاجروں، جادواور کالے علم کے ماہروں جب کہ دوسری طرف علم کے سمندروں، لاکھوں حدیثوں کے بمع اسناد حافظوں، اتباع سنت میں غلو کرنے والے عالموں، عشاء کے وضو سے برسوں فجر کی نماز پڑھنے والے بزرگوں اور چہرہ دیکھ کر تمام رازوں کا کشف ہوجانے والے پیروں تک رسائی ہوئی۔

کچھ عرصہ پہلے لاہور کے ایک معروف شیخ کی مجلس میں حاضری ہوئی۔ حاضرین میں پڑھے لکھے حضرات (بمع پی ایچ ڈی) ساٹھ ستر کی تعداد میں موجود تھے۔ مربی نے شیخین (حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ) کے مختصر تذکرے کے بعد اپنے اکابرین کے وضو کا تفصیلی ذکر چھیڑ دیا جو ہر نماز کے وضو کے لیے لباس بدلتے تھے۔ یہ بات کچھ ایسے انداز میں کی گئی کہ محفل میں بیٹھے نوجوان اپنا سر دھننے لگے۔ میں سوچنے لگا کہ کیا شیخین کی معروف اور جفاکش زندگی ایسی نزاکتوں کی متحمل ہوسکتی تھی کہ وہ دن میں پانچ نمازوں کے اوقات میں دس مرتبہ جوڑے اتاریں اور چڑھائیں۔ کیا زندہ قومیں وقت کے ایسے ضیاع کا بوجھ اٹھاتی ہیں؟

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت ، نہ نگاہ

ایسے لگتا ہے آج کی 'سوال کرتی ہوئی دنیا' میں ہم آج بھی اپنی مجلسوں اور درباروں میں ایسی ہی مخلوق پسند کرتے ہیں جو ہماری تراشیدہ کہانیوں اور غیر حقیقی باتوں پر واہ واہ کے ڈونگرے برسائے، اور سوال کرنے کو بے ادبی اور گستاخی پر محمول کرے اور یوں تجزیے اور تنقیدی صلاحیتوں سے محروم نوجوانوں کو مزید گم ضم (صم بکم عمی) بنا دیا جائے۔

گِلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الہ الا اللہ

ہمارے ہاں جس شیخ کی مجلس میں ساٹھ ستر افراد موجود ہوں وہ کامیاب شیخ گنا جاتا ہے۔ کوئی چھ سات سو، کوئی چھ سات ہزار لیکن خال خال ایسے رسوخ والے بھی ہیں جن کی پیروی ساٹھ ستر ہزار تک جا پہنچتی ہے (شیخ قادری، شیخ منارہ، شیخ کربوغہ وغیرہ)

'پردہ فرمائے ہوئے' حضرات کے عرسوں پر حاضری چھ سات لاکھ تک ہوجاتی ہے۔

(دربار ہجویری، دربارہ گولڑہ، گھمکول شریف وغیرہ)۔اس عالمگیریت کے دور میں ایسے چھوٹے بڑے خانقاہی سلسلوں اور اسلامی جماعتوں کی تعداد ہزاروں تک ضرور پہنچتی ہے۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ کار اور تربیت کا انداز ہے۔ایسے اکثر گروہوں میں یہ بات راسخ ہے کہ ان کا مخصوص شیخ ہی مسائل کا صحیح حل پیش کرتا ہے جب کہ معاشرے میں 'وحدت فکر' مفقود ہے۔ایسے 'اندھے پیرو' ایک نئی طرح کا بت پوج رہے ہوتے ہیں۔'فنافی الشیخ' ہونے میں ساری زندگی کھپ جاتی ہے اور اگلے مراحل میں 'فنافی اللہ' کا مرحلہ شاذ ہی آتا ہے۔

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

کیا اب ہماری گزرتی ہوئی معمر نسل نوجوانوں کو ایسی اندھی پیروی سے بچانا چاہتی ہے یا وہ 'پیر تسمہ پا' کی طرح تا زندگی اس کے جسم اور اعصاب دونوں پر سوار رہنا چاہتی ہے۔ قدرت نے شاید خود اب فیصلے کر لیے ہیں کہ اب انسانوں پر انسانون کی اجارہ داری اور انسانوں کو انسانوں کا غلام رکھنے کا رواج ختم کر دیا جائے، چاہے وہ مذہبی پیشوائیت کی صورت میں ہو یا نبیوں کی جعلی وراثت کی صورت میں۔

عالمگیریت نے حق کے متلاشی (قلب منیب رکھنے والے) سمجھدار نوجوانوں کے لیے سب سے بڑا راستہ 'انٹرنیٹ' کھول دیا ہے۔ یہ ایسا تیر ہے جسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔اگر ہمارے رب نے کائنات لپیٹنے کا فیصلہ موخر کر رکھا ہے تو ہمیں وہ تدبیریں کرنی ہوں گی جن سے فحاشی کے سیلاب میں غرق ہو جانے والا نوجوان اگر دوبارہ ابھر سکے تو اسے کشتیٔ نوح میسر آ جائے جس سے قلب منیب رکھنے والے نوجوانوں کو بآسانی ایک 'مزکی' دستیاب ہو جائے..... ایسا 'مزکی' جو ان میں 'انتشار فکر' کو ختم کر کے 'وحدت فکر' اور ایک جیسی نفسیات پیدا کر دے تا کہ وہ حق و باطل میں فرق (فرقان) کر سکیں۔ایسا 'مزکی' یا تو کوئی 'غیر متنازعہ شیخ' ہو سکتا ہے یا کوئی 'غیر متنازعہ کتاب'۔ ہماری غیر متنازعہ کتاب ایک معجزانہ 'الکتاب' ہے جو 'امام مبین' کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر مغرب کے پیدائشی 'اینگلو سیکسن' اس کتاب کا ترجمہ پڑھ کر 'ہدایت' سے فیض یاب ہو سکتے ہیں تو ہمارا انابت رکھنے والا نوجوان کیوں نہیں؟ ہم نے اپنے نوجوانوں کو قرآن کے براہِ راست استفادے سے بہت حد تک ڈرا دیا ہے۔ہم اس دور میں بھی اس ڈر کا شکار ہیں کہ لوگ خود سے اپنے ذاتی تزکیے

اوراصلاح کے لیے قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھ کرغلام احمد پرویز یا علامہ غامدی بن جاتے ہیں اورہمیں للکارنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف ہم اپنی ذہنی آسودگی کے لیے ڈیل کارنیگی کی مترجم کتاب 'پریشان ہونا چھوڑیئے اور جینا شروع کیجیے' پڑھتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں لوگوں کے اس سے استفادے میں کوئی ممانعت نہیں سمجھتے۔ کیا اس آگہی کے دور میں ہم لوگوں کوقرآن سے استفادے سے روک سکتے ہیں؟

اس وقت قرآن کو باترجمہ براہِ راست اور بلاکم وکاست پڑھنے اور سمجھنے میں کیا رکاوٹیں آسکتی ہیں؟

۱- سب سے پہلی رکاوٹ ابلیس ہے یعنی شیطان کبیر جو 'شیخ کبیر' کا روپ دھار چکا ہے، اس کتاب کوکھولتے ہی وسوسوں کے ساتھ حملہ آور ہوگا تاکہ آپ کواس ترجمے پرغور کرنے اورعمل کرنے کے عزم کا موقع ہی نہ مل سکے۔ دل جمانا مشکل لگے گا اور سوچ جمود (Thought Block) کا شکار ہوجائے گی۔

۲- ابلیس کے زیراثر بڑی طاقتیں اوران کے سرغنے اپنی مجلسوں (پارلیمنٹوں) میں بارہا اس کتاب کواُٹھا کر برملا یہ اظہار کرچکے ہیں کہ جب تک یہ کتاب کرۂ ارض پرموجود ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ تیسری دنیا کے مرعوب نام نہاد 'مسلمان' بھی دل کے نہاں خانوں میں اسی یقین کو پالے ہوئے ہیں اوراس کی ترویج کرتے رہتے ہیں۔

۳- عالمی طور پرابلیسی ابلاغ (الیکٹرانک اور پیپر میڈیا) بھی دنیا بھر کے انسانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کررہا ہے کہ اس کتاب سے دوررہو۔ دین بیزار یا سفیدآقاؤں کے پےرول پر کام کرنے والے صحافی اوراینکرز اس تگ ودو کا ہراول دستہ ہیں۔

۴- چوتھی بڑی رکاوٹ 'نیم ملا' اس لیے ڈالتے ہیں کہ قرآن سے روشناس نوجوانوں کے عملی مسائل کے سوالات کے وہ متحمل نہیں ہوسکتے۔ وہ قرآن فہمی کی تحریکوں کوفتنہ کہہ کررڈ کردیتے ہیں۔ انہیں یہ بھی خطرہ رہتا ہے کہ جنت اوردوزخ بانٹنے کے منصب سے محروم کردیئے جائیں گے جب کہ قرآن مخلوق اورانسانوں کی تقدیس کی نفی کرتا ہے۔ انہیں اپنے نمازیوں کواپنا گرویدہ رکھنے کے لیے سخت مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔

کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو، کلیسا سے اٹھا دو

شاید قدرت نے 'معیاری شیخ' نہ ہونے کی وجہ سے اپنی مخلوق کے لیے ابلاغ کا وسیع بندوبست فرمادیا ہے تاکہ انابت رکھنے والے انسانوں اور خالق کے درمیان کوئی حائل نہ رہ سکے۔ یوم تفریق (نائن الیون) کے بعد دنیا میں اور خصوصاً مغرب میں مصحف کی خریداری میں دس گنا اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اہل اسلام کے بارے میں تجسس بڑھا ہے۔ بے شمار غیر مسلموں نے قرآن کا ترجمہ پڑھ کر حق قبول کیا اور اپنے آپ کو 'پیدائشی مسلمانوں' سے زیادہ بہتر 'عباداللہ' ثابت کیا۔ ہمارے ملک میں بھی بے شمار ایسی مثالیں ہیں کہ مذہب بیزار اور ملا بیزار نوجوانوں نے 'الکتاب' سے رجوع کیا اور اپنی زندگی کو درست کرڈالا۔

اس سارے منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرے میں مثبت تبدیلی کے لیے سب سے بڑا اہم قدم کوئی ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ عوام الناس کے لیے قرآن کریم سے براہِ راست استفادے کے تمام دروازے کھول دئے جائیں۔

۱- مستقر، مستودع اور مسجد تینوں دائروں میں قرآنی حلقوں کا آغاز کیا جائے۔ امام شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے مطابق ناظرے کے بعد قرآن کے متن کا ترجمہ سیکھنے سکھانے کی کوشش کی جائے۔

۲- اگر استاد یا معلم میسر نہ ہو تو کسی غیر متنازعہ عام فہم ترجمے کو اصل متن کے ساتھ دیکھنا شروع کیا جائے (مثلاً مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کا ترجمہ جو صوت القرآن چینل پر بھی غیر متنازعہ ہونے کی وجہ سے آتا ہے)۔

۳- ترجمہ خود وضاحت کردیتا ہے کہ آیت 'محکمات' میں سے ہے یا 'متشابہات' میں سے۔ مبتدی کو سمجھا دیا جائے کہ متشابہات کے پیچھے زیادہ نہ لگا جائے بلکہ محکمات سے عملی نکات اخذ کر کے عملی تدبیر کی جائے۔ اوامر (Do`s) اور منہیات (Dont`s) کو اخذ کیا جائے اور بار بار ان کا اعادہ کیا جائے کہ ان ہی کی پوچھ گچھ ہوگی۔

۴- ذاتی اخلاقی اصلاح اور معاملات کی اصلاح کے احکامات کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا

جائے تاکہ اپنی ذاتی اور معاشرتی خرابیوں کا سدِ باب فوری شروع کر دیا جائے کیونکہ آج کا انسان اپنی خواہشات کو خدا بنا کر مجنونانہ انداز میں دنیا پرستی میں محو ہے۔ چونکہ قرآن دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کرتا ہے تو آج کے دور میں یہ ہمارا بہترین مزکی و مربی بن جاتا ہے۔ کوشش کی جائے کہ قرآن کی روشنی میں معاشرے میں ایک جیسی فکر، سوچ اور نفسیات کے حامل پاکستانی مہیا ہو جائیں تاکہ اخوت و اتحاد کی فضا سازگار رہو۔ اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام اور قرآنی کسوٹی (فرقان) پر پرکھتے ہوئے صالح لوگوں کی تلاش (صحبت) اور ان کو امت کی لڑی میں پرونے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

امت کی نشاۃ ثانیہ میں سب سے بڑا محرک قرآن فہمی اور پھر اس پر عمل کا عزم ہی ہو سکتا ہے۔ دورِ رسول کے نوجوانوں کے لیے بھی نبی اکرم ﷺ نے اسے ہی محرک بنایا۔ ایک دور دراز کا نوجوان آنے جانے والے قافلوں سے قرآن سنتا سمجھتا اور یاد کرتا۔ عرصے بعد جب وہ مدینے آتا ہے تو اپنے محلے کی مسجد کا امام بنا دیا جاتا ہے۔ مکے میں قرآن سے کان لپیٹ کر گزر جانے والے جب مدینے کی قید میں آتے ہیں تو انہیں مسجد کے ستونوں سے اس لیے باندھ دیا جاتا ہے کہ قرآن ان کے کانوں سے ایک دفعہ گزر جائے۔ یہ تو 'تذکرہ' ہے کوئی اگر اس کو تھام کر اپنے رب کی طرف راستہ تلاش کرتا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی کرنے والے رب کے ہاں اپنا جواب سوچ لیں۔ امت کے شیوخ، مفتیان، علماء اور پیرنئی نسل کو قرآن کی طرف راغب کریں ورنہ امت کے زوال کے اسباب میں اتحاد کا نہ ہونا بھی امت کی قرآن سے دوری کی وجہ سے ہے۔ یہ بات 'شیخ' کو مالٹا کی اذیت ناک قید میں سمجھ میں آتی ہے لیکن رہائی کے بعد 'ضعف کی محدود مہلت' امت کو یہ بات باور کروانے میں بہت ہی کم محسوس ہوتی ہے۔

ہیں اربابِ اقتدار فرنگی کی غلامی میں مگن
ہم کیا سوچ کے تم سے کہیں آزادی مبارک

پاکستانیات ڈاکٹر محمد امین

اعلیٰ عدلیہ کی طرف سے اسلامی دفعات کی بے توقیری

کیا ہماری 'قرارداد مقاصد' بھارتی قرارداد مقاصد کا چربہ ہے؟

آئینی ترامیم سے متعلق فیصلے میں جسٹس ثاقب نثار صاحب کے 'خلافِ حقیقت' ریمارکس

۱- ہم اعلیٰ عدلیہ کا اور اس کے ججز کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن اگر سوئے اتفاق سے کسی محترم جج کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے آئے جو خلاف واقعہ ہو یا تاریخی حقائق سے ٹکراتی ہو تو احقاق حق کا تقاضا ہے کہ اس کی تصحیح کر دی جائے تاکہ وہ غلطی ریکارڈ کا حصہ نہ بن جائے اور دوسرے لوگ اس کو صحیح سمجھ کر اس سے غلط نتائج اَخذ نہ کریں اور اسے مستند سمجھ کر اس کا حوالہ نہ دیتے پھریں۔

۲- اس ضمن میں مذکورہ اکثریتی فیصلے میں ایک سنگین سقم پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس فیصلے نے پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کا تقریباً کلی اختیار دے دیا ہے تاہم فیصلے کے آخری حصے میں بطور استثنیٰ آئین کے تین ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں ختم نہیں کیا جاسکتا یا اس طرح تبدیل نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا مقصد و مدعا فوت ہو جائے۔ تاہم حیران کن بات یہ ہے کہ آئین کی ان خصوصیات میں 'اسلامی دفعات' کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس پر اسلامی حلقوں کی تشویش بالکل بجا ہے اور اس سنگین فروگزاشت کا ازالہ ضروری ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ اس پر ریویو پٹیشن میں جائے اور اگر حکومت یہ کام نہ کرے تو اسلامی جماعتوں اور اداروں کو آگے بڑھ کر خود یہ کام کرنا چاہیے۔

۳- اسی طرح مذکورہ فیصلے کے آخر میں عدالت عظمیٰ کے محترم جج جناب جسٹس ثاقب نثار صاحب نے جو اختلافی نوٹ لکھا ہے، اس میں انہوں نے ایک عجیب بات کہی ہے اور وہ یہ کہ 'ہماری قرارداد مقاصد اس بھارتی قرارداد مقاصد کی نقل ہے جو جنوری ۱۹۴۷ء میں منظور کی گئی تھی یہاں تک کہ اس کی کئی دفعات وہاں سے حرف بحرف لے لی گئی ہیں'۔

یہ بات نہ صرف غلط ہے بلکہ تاریخی ریکارڈ کی بھی نفی کرتی ہے کیونکہ تقسیم برصغیر سے پہلے ہی

صوبائی مجالس مقنّنہ کے نمائندوں نے بالواسطہ انتخاب کے ذریعے ایک دستور ساز اسمبلی منتخب کر لی تھی۔ اس اسمبلی کا پہلا اجلاس ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہوا جس میں پنڈت نہرو نے قرارداد مقاصد کا مسودہ پیش کیا جو بحث کے بعد منظور کر لیا گیا۔ جن علاقوں نے پاکستان کا حصہ بننا تھا، ان کے منتخب نمائندے اس اسمبلی میں موجود نہ تھے۔ یہ واضح رہے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے کیبنٹ مشن پلان کی رو سے بنگال، پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبے (NWFP)، بلوچستان اور آسام کے ضلع سلہٹ (جس نے ریفرنڈم کے نتیجے میں پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تھا) بھارت کی مجلس دستور ساز کے ارکان نہ رہے تھے۔ مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کے نئے صوبوں میں تازہ انتخابات کرائے گئے اور ان کے منتخب نمائندوں سمیت بھارت کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہوا جس میں بھارت کا نیا دستور ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو منظور کر لیا گیا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء کو جو قرارداد مقاصد بھارتی مجلس دستور ساز نے منظور کی تھی اسے نہ تو آئین کا حصہ بنایا گیا اور نہ ہی اسے آئین کے دیباچے میں شامل کیا گیا۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو تخت برطانیہ کی رضامندی سے قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو منظور کیا گیا جس نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے موثر ہونا تھا۔ اس کی رو سے برٹش انڈیا دو آزاد ریاستوں بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہو جاتا جن کی مجالس دستور ساز کو یہ غیر محدود اختیار دیا گیا کہ وہ جیسے دساتیر چاہیں بنا لیں اور انہیں آئندہ برطانوی پارلیمنٹ سے رجوع کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو بننے والی مجلس دستور ساز بھارت کی مجلس دستور ساز متصور ہوگی اور پاکستان اپنے لیے نئی مجلس دستور ساز بنائے گا۔

اس کے نتیجے میں پاکستان کی مجلس دستور ساز بنائی گئی جس نے کئی اجلاسوں کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد منظور کر لی۔ یہی قرارداد مقاصد، معمولی تبدیلیوں کے بعد، دستور ۱۹۵۶ء اور دستور ۱۹۷۳ء کا حصہ بنا دی گئی۔ یہ قرارداد مقاصد جس کے بارے میں فاضل جج صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ بھارتی قرارداد مقاصد کا چربہ ہے اور اس کی بعض دفعات وہاں سے حرف بحرف نقل کر لی گئی ہیں، ہم ان کی اہم دفعات کا تقابلی مطالعہ کرنے کے لیے دونوں کا انگریزی متن نیچے دے رہے ہیں تاکہ اس الزام کی حقیقت سامنے آ سکے کہ پاکستانی قرارداد مقاصد میں بھارتی قرار

دادمقاصد سے کس حدتک استفادہ کیا گیا ہے:

Pakistan Objective Resolution	Indian Objective Resolution
"Whereas sovereignty over the entire universe belongs to Allah Almighty alone and the authority which He has delegated to the State of Pakistan, through its people for being exercised within the limits prescribed by Him is a sacred trust; This Constituent Assembly representing the people of Pakistan resolves to frame a Constitution for the sovereign independent State of Pakistan;	This Constituent Assembly declares its firm and solemn resolve to proclaim India as an Independent Sovereign Republic and to draw up for her future governance a Constitution;
Wherein the State shall exercise its powers and authority through the chosen representatives of the people;	WHEREIN the territories that now comprise British India, the territories that now form the Indian States, and such other parts of India as are outside British India and the States as well as such other territories as are willing to be constituted into the Independent Sovereign India, shall be a Union of them; and

Wherein the principles of democracy, freedom, equality, tolerance and social justice as enunciated by Islam shall be fully observed;	WHEREIN the said territories. whether with their present boundaries or with such others as may be determined by the Constituent Assembly and thereafter according to the law of the Constitution, shall possess and exercise all powers and retain the status of autonomous units, together with residuary powers and functions of Government and administration, save and except such powers and functions as are vested in or assigned to the Union, or as are inherent or implied in the Union or resulting therefrom; and
Wherein the Muslims shall be enabled to order their lives in the individual and collective spheres in accordance with the teachings and requirements of Islam as set out in the Holy Quran and the Sunnah;	WHEREIN all power and authority of the Sovereign Independent India, its constituent parts and organs of Government, are derived from the people; and

Wherein adequate provision shall be made for the [religious] minorities to freely profess and practice their religions and develop their cultures;	WHEREIN shall be guaranteed and secured to all the people of India justice, social, economic and political; equality of status, of opportunity, and before the law; freedom Of thought, expression, belief, faith, worship, vocation, association and action, subject to law and public morality; and
Wherein the territories now included in or in accession with Pakistan and such other territories as may hereafter be included in or accede to Pakistan shall form a Federation wherein the units will be autonomous with such boundaries and limitations on their powers and authority as may be prescribed;	WHEREIN adequate safeguards shall be provided for minorities, backward and tribal areas, and depressed and other backward classes; and
Wherein shall be guaranteed fundamental rights including equality of status, of opportunity and before law, social, economic and political justice, and freedom of thought, expression, belief, faith, worship and association, subject to law and public morality;	WHEREIN shall be maintained the integrity of the territory of the Republic and its sovereign rights on land, sea, and air according to justice and the law of civilized nations; and

Wherein adequate provisions shall be made to safeguard the legitimate interests of minorities and backward and depressed classes;

Wherein the integrity of the territories of the Federation, its independence and all its rights including its sovereign rights on land, sea and air shall be safeguarded; So that the people of Pakistan may prosper and attain their rightful and honored place amongst the nations of the World and make their full contributed towards international peace and progress and happiness of humanity".

This ancient land attains its rightful and honored place in the world and makes its full and willing contribution to the promotion of world peace and the welfare of mankind."

دونوں قراردادوں کے متون سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ متن، الفاظ ومعانی اور مزاج وروح ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں اور یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ پاکستانی قرار دادمقاصد، بھارتی قرارداد مقاصد کا چربہ یا اس کی نقل ہے۔ یہ کہنا اس لیے بھی تعجب انگیز ہے کہ خود فاضل جج نے اپنے اختلافی نوٹ کی ابتداء میں قرارداد مقاصد کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں اللہ کے تصور حاکمیت کا اقرار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ساری کائنات کی حاکم اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یہ کہ پاکستانی عوام اقتدار ایک مقدس امانت کے طور پر استعمال کریں گے۔ نیز قرارداد مقاصد کے ۱۱ نکات جو ریاست کے اسلامی کردار اور اسلام کے عدل اجتماعی کے آئینہ دار ہیں، ان کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھارتی قرارداد مقاصد سے اخذ کیے گئے ہیں؟ اس قرارداد مقاصد کی منظوری کے وقت جو تقاریر وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاں، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد انصاری اور میاں افتخار الدین (جو پاکستان کے ابتدائی سالوں میں

بائیں بازو کے سرکردہ رہنما تھے) نے کیں، اور جو اسمبلی کے ریکارڈ اور تاریخ کا حصہ ہیں، ان سے قرار دادِ مقاصد کے متن اور اسلامی مقاصد کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا (تفصیل کے لیے دیکھیے شریف المجاہد کی کتاب Ideology of Pakistan مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور کتاب 'تصور پاکستان - بانیان پاکستان کی نظر میں' مطبوعہ شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)۔

۴- ریکارڈ کی درستی کی خاطر ہم یہاں محترم جج صاحب کی ایک اور غلطی کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اختلافی نوٹ میں لکھا ہے کہ سپریم کورٹ کے وہ پانچ جج جنہوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا اور مستعفی ہوگئے انہوں نے یہ عدلیہ کے وقار کے لیے کیا اور ان کا یہ اقدام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اس بارے میں صحیح اور قانونی صورت یہ ہے کہ جب جنرل مشرف نے اکتوبر ۱۹۹۹ء میں اقتدار پر قبضہ کیا تو اس وقت سپریم کورٹ میں بارہ جج تھے، پانچ سندھ سے پانچ پنجاب سے اور دو صوبہ سرحد سے۔ جنرل مشرف نے جنوری ۲۰۰۰ء میں ایک حکمنامہ جاری کیا جس میں سپریم کورٹ کے ججز سے کہا گیا کہ وہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے پی سی او کے تحت حلف وفاداری اٹھائیں اور جو ایسا نہیں کریں گے وہ اپنے عہدوں پر قائم نہیں رہیں گے۔ اس پر چھ ججوں نے (سندھ سے پانچ اور پنجاب سے ایک) پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور نتیجتاً وہ سپریم کورٹ کے جج نہ رہے۔ پنجاب سے چار اور صوبہ سرحد سے دو ججوں نے حلف اٹھا لیا اور وہ سپریم کورٹ کے جج کے طور پر کام کرتے رہے جب کہ جسٹس ارشاد حسن خاں چیف جسٹس ہوگئے۔ تو خلاصہ یہ کہ یہ چھ جج تھے پانچ نہ تھے اور وہ مستعفی نہیں ہوئے تھے بلکہ جیسا کہ ہم نے کہا کہ حلف نہ اٹھانے کے نتیجے میں انہیں جبری ریٹائرڈ قرار دے دیا گیا تھا اور یوں وہ سپریم کورٹ کے جج نہ رہے۔

ہم ایک دفعہ پھر کہنا چاہیں گے کہ ہم 'عدالت عظمیٰ' کا اور اس کے فاضل ججوں کا بے حد احترام کرتے ہیں تاہم ریکارڈ کی درستی کے لیے عدالتی فیصلے میں جو کمزوریاں ہمیں نظر آئیں، ان کی تصحیح کرنا ہم نے ضروری سمجھا۔ امید ہے اسلامی اور قانونی حلقے ہمارے موقف کی تائید کریں گے۔

عالم اسلام مدیر

افغان طالبان اور داعش
دہشت گردی میں امریکہ کا کردار

افغان مذاکرات

امریکہ اور نیٹو نے افغانستان کو تباہ کرنے اور طالبان کی مسلح مزاحمت کو توڑنے کے لیے ہر وہ ظلم اور ہر وہ ہتھکنڈا استعمال کیا جو وہ کر سکتے تھے لیکن وہ ناکام ہوئے اور ملا عمر کی قیادت میں نہتے طالبان نے ان کو گوریلا جنگ میں شکست دی۔ امریکہ اور یورپ کے لیے اتنی بڑی ناکامی کو برداشت کرنا اور اسے تسلیم کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ وہ ناکام ہو کر واپس جا چکے ہیں لیکن انہیں شکست تسلیم کرتے ہوئے عار آتی ہے۔ لیکن یہ گوری چمڑی والے بڑے عیار ہیں جو جنگ وہ میدانوں اور پہاڑوں میں ہار چکے ہیں وہ اسے عیاری سے مذاکرات کی میز پر جیتنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے نہ صرف پاکستان کی حمایت، حسبِ معمول، انہیں حاصل ہے بلکہ اس دفعہ بھارت کے ساتھ ہمسایہ ملک چین کی اشیر باد بھی انہوں نے حاصل کر لی ہے۔ ہر ایک کا اپنا مفاد ہے لیکن سچ یہی ہے کہ **الکفر ملة واحده**. چین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت نہیں چاہتا کیونکہ اس سے سنکیانگ کے مسلمانوں کو تقویت ملے گی جو چینی حکومت کے ظلم و جبر اور اسلام دشمن اقدامات کے خلاف مزاحمت کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان حالات میں امریکہ و یورپ کی خواہش یہ ہے کہ ان کی گماشتہ ''جمہوری'' افغان حکومت اور طالبان میں مذاکرات ہوں اور کسی نہ کسی طرح طالبان افغان دستور اور پارلیمنٹ کو تسلیم کر لیں اور گماشتہ حکومت کی کابینہ میں کچھ وزارتیں قبول کر لیں اور یوں افغانستان میں امن قائم ہو جائے اور ہمسایہ ممالک اور ساری دنیا خوش ہو جائے اور راوی چین کے ڈنکے بجائے بلکہ ہو سکے تو اوبامہ کو امن کا نوبل ایوارڈ بھی دلوا دیا جائے۔

لیکن کیا افغان طالبان کی قیادت اتنی ہی بدھو ہے کہ وہ ۱۳ سالہ جہاد کی یہ قیمت وصول کرنے پر راضی ہو جائے گی؟ جب تک ملا عمر زندہ تھے اس طرح کی کسی ڈیل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اگر ملا عمر کے بعد قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو ملا عمر جیسی سوچ رکھتے ہوں تو اب بھی اس طرح کے مذاکرات کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ ان کی کامیابی کا کوئی امکان ہے۔

اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ امریکی سی آئی اے اپنے حلیفوں کی مدد سے افغان طالبان میں سرنگ لگانے میں کامیاب ہوجائے جیسا کہ وہ اس سے پہلے القاعدہ، پاکستانی طالبان اور داعش میں سرنگ لگانے میں کامیاب ہوچکی ہے اوران سے اپنی مرضی کی پالیسیوں پرعمل کرارہی ہے۔افغان طالبان کی یہ منفرد خصوصیت اورنمایاں خوبی تھی،جس کی ہم جیسے درویش اور بہت سے دوسرے لوگ تعریف کرتے تھےاوراس وجہ سےان کی حمایت کرتے تھے کہ انہوں نے سی آئی اے اور دوسری دشمن خفیہ ایجنسیوں کو اپنے اندر گھسنے نہیں دیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ طالبان قیادت کو جرأت وفراست عطا فرمائے اور انہیں دشمن کی ابلیسی سازشوں، عیارانہ چالوں اور ان کے مکروفریب سے بچائے اوران کے جہادکو کامیاب فرمائے تاکہ وہ افغانستان میں پہلے کی طرح ایک خالص اسلامی حکومت قائم کرسکیں۔

پاکستان کی سیاسی اورعسکری قیادت ابھی تک پرویزمشرف کی امریکہ نواز پالیسیوں پرعمل پیرا ہے۔ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے کوصرف امریکی عینک سے نہ دیکھیں بلکہ پاکستان اورامت مسلمہ کے وسیع تر مفاد میں اس کا جائزہ لیں۔انہیں چاہیے کہ امریکی کیمپ سے باہر آجائیں اورطالبان کی حمایت کریں یاکم ازکم افغانستان کے معاملے میں غیرجانبدار ہوجائیں لیکن افغانستان میں امریکی پالیسیوں کی حمایت بہرحال انہیں زیب نہیں دیتی کہ یہ پاکستان،اسلام اور امت مسلمہ کے مفاد کے خلاف ہیں۔ پارلیمنٹ اورکئی آل پارٹیز کانفرنس میں حکومت اس کا وعدہ کرچکی ہےلیکن امریکی دباؤ کی وجہ سےاس پرعمل درآمدنہیں کرپاتی اوریہی خرابی کی اصل جڑ ہے۔

افعان مذاکرات کےانعقاداورانہیں کامیاب بنانے کے لیے پاکستان کے خلاف ترغیب و ترہیب کے امریکی اقدامات جاری ہیں۔مشرقی بارڈر پر بھارت اورمغربی باررڈ پر افغانستان، پاکستان پردباؤڈال رہے ہیں۔پاکستان کےفنڈز روکے جارہے ہیں۔داعش کومسلسل ہوابنا کرپیش کیاجارہاہے۔افغان طالبان کوان سےلڑانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ پاکستان اورچین سےان پر دباؤ ڈلوایا جارہا ہے۔غرض امریکہ افغان طالبان کو ہرطرح سے مجبورکررہا ہے کہ وہ مذاکرات کریں تاکہ امریکہ پہاڑوں میں ہاری ہوئی جنگ مذاکرات کی میز پر جیت سکے۔

پاکستانی طالبان کے بارے میں ہمارا موقف

ہم روس اورامریکہ کےخلاف افغان طالبان کے جہادکی حمایت کرتے ہیں لیکن امریکہ و

بھارت کی چھتری تلے پاکستانی طالبانی کی ریاست پاکستان کے خلاف مسلح جدوجہد کی حمایت نہیں کرتے۔ ہمارے اس اصولی موقف کی تفصیل یہ ہے:

۱- اگر کوئی مسلم حکومت حملہ آور کفار کے خلاف مزاحمت کرے تو یہ جہاد ہے اور اگر کفار کے حملے کے نتیجے میں مسلم حکومت ختم ہو جائے یا کفار اپنی پشت پناہی میں گماشتہ مسلم حکومت قائم کر دیں اور عوام غلامی قبول کرنے کی بجائے اس کی مسلح مزاحمت شروع کر دیں تو یہ بھی جہاد ہے۔

۲- تاہم اگر مسلم حکومت غیر صالح ہو اور اپنی اسلامی ذمہ داریاں بطریق احسن پوری نہ کر رہی ہو تو اس کی اصلاح کے لیے پرامن کوششیں کی جانی چاہئیں اور اس کے خلاف خروج اگر شرعاً مباح بھی ہو تو اسے بدل کر صالح اسلامی حکومت لانے کے لیے ہمارے زمانے میں مسلح جدوجہد ہمارے نزدیک (اور اکثر معاصر علماء کی رائے میں بھی اجتہاداً) جائز نہیں ہے کیونکہ:

i- آج کل ریاست اس قدر طاقتور ہے کہ اس کی مسلح افواج کو شکست دینا ممکن ہی نہیں جب کہ ان مسلم حکومتوں کو امریکہ و مغرب کی سرپرستی اور موثر عملی اعانت بھی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً کیا پاکستان میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ عوام کا کوئی مسلح گروہ پاکستان کی فوج، ائیر فورس، نیوی، رینجرز، پولیس.....کو شکست دے کر کامیاب ہو سکتا ہے؟

ii- مغرب کی اسلام اور مسلم دشمن قوتیں اکثر ایسی مسلم تحریکوں میں سرنگ لگا لیتی ہیں انہیں ڈالر، اسلحہ اور تربیت دیتی ہیں تاکہ وہ مسلمان حکومتوں کے ساتھ لڑیں اور لڑ کر دونوں کمزور ہوں اور دونوں طرف سے جانی اور مالی نقصان ہو۔ بہت سے مسلم اور غیر مسلم دانشوروں اور محققین کا یہ تجزیہ ہے کہ القاعدہ، پاکستانی طالبان اور داعش میں امریکی نفوذ ایک امر واقعی ہے جسے جھٹلانا ممکن نہیں۔

iii- کئی اسلامی جماعتیں اور تحریکیں مسلم ریاست کو صحیح اور مثالی اسلامی ریاست بنانے اور اقتدار کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد کر رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ نیکی کا کام ہے اور ایک اہم اور ضروری کام ہے لیکن ان جماعتوں نے اور دوسری دینی تحریکوں اور اداروں نے مسلم فرد کی دعوت و اصلاح پر کما حقہ توجہ نہیں دی اور اس کے لیے زیادہ محنت نہیں کی حالانکہ پیغمبروں کے کام کی ترتیب الاقرب فالاقرب کی ہے یعنی پہلے فرد کی اصلاح، پھر اس کے گھر، خاندان اور گلی محلے کی اصلاح اور پھر پورے مسلم معاشرے کی اصلاح اور پھر اس کے نتیجے میں مسلم ریاست کی اصلاح۔ فرد کو بدلے بغیر معاشرے میں اور معاشرے کو بدلے بغیر ریاست

میں عملاً کوئی تبدیلی لائی نہیں جاسکتی اور فرد کو بدلنے کا نصاب ہے: تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس اور اسی منہج پر کام کرنے کا نتیجہ ہوسکتا ہے، فرد کی دنیا میں اللہ کی عبادت واطاعت کی زندگی گزارنا اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور نعمتوں کا حصول۔ لیکن تعمیر فرد کی اس اہمیت کے باوجود ہماری اکثر دینی قوتوں نے فرد کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ نہیں دی جس کے نتیجے میں دینی عناصر بالعموم عوامی حمایت سے بھی محروم رہتے ہیں اور عوام کی دین سے وابستگی بھی دن بدن کمزور ہورہی ہے اور وہ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے شعوری یا غیر شعوری طور پر شکار بنتے جارہے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم افغان طالبان کی تو حمایت کرتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور وہ غیر مسلم قوتوں کے آلہ کار بھی نہیں بنے لیکن پاکستانی طالبان کی ہم حمایت نہیں کرتے کیونکہ وہ ایک مسلم حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں اور ان میں امریکہ و بھارت کی پشت پناہی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔

داعش، خلافت اور دہشت گردی

مسلمان اپنے سیاسی نظام کو 'خلافت' کہتے ہیں خواہ وہ 'خلافت راشدہ' جیسی خلافت علی منہاج النبوہ ہو یا بعد کی صدیوں میں نشوونما پانے والی کئی طرح کی خامیوں سے مملو خلافت ہو۔ ۱۹۲۴ء میں عثمانی خلافت اگرچہ بظاہر ایک مسلمان فرد (کمال اتاترک) اور ایک مسلمان جماعت (Young Turks) اور ایک مسلمان حکومت (ترکی) کے ہاتھوں ختم کی گئی لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ جنگ عظیم اوّل میں ترکی خلافت کی شکست اور مسلمان علاقوں پر یورپی غلبے اور مسلمانوں کے مغربی فکری وتہذیب سے مرعوبیت اور سب سے بڑھ کر یورپی دباؤ اور سازشوں کا نتیجہ تھی۔ مغرب نے پہلے تو کوشش کی کہ وہ مسلم علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنالے اور اس میں کامیابی کے بعد اگلے مرحلے میں جب دوسری جنگ عظیم کے بعد اسے مجبوراً مسلمان ملکوں کو کچھ سیاسی آزادی دینا پڑی تو اس کی کوشش یہ ہوئی کہ وہ پرامن ذرائع سے (تعلیم، میڈیا، قرضوں، جمہوریت، برتھ کنٹرول..... کے ذریعے) انہیں قابو میں رکھے اور انہیں خلافت اسلامی یا اسلام کا سیاسی نظام قائم نہ کرنے دے۔ چنانچہ اکثر مسلم ممالک میں اس نے 'جمہوریت' کے ذریعے اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور جہاں وہ کامیاب ہو بھی گئیں (مثلاً الجزائر، مصر اور فلسطین میں) تو وہاں بھی انہیں اقتدار میں آنے اور کام کرنے کا موقع نہ دیا۔ اس سے امریکہ

اور یورپ نے مسلمانوں کو گویا خود یہ پیغام دیا کہ وہ کسی قیمت پر اسلامی خلافت یا اسلام کا سیاسی نظام (خواہ اس کا نام 'خلافت' یا 'امارت' نہ بھی ہو جیسے جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون خلافت کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے) قائم نہیں ہونے دیں گی۔ چنانچہ پرجوش مسلمانوں کو خود امریکہ و یورپ نے بزور بازو خلافت قائم کرنے کا راستہ دکھایا۔ اور جب وہ اس راسے پر چل پڑے تو پھر ان پر ظلم وستم کی انتہا کر دی لیکن پروپیگنڈے کے زور پر اس کے مظالم اور دہشت گردی پر پردے پڑے رہے اور ان مظالم اور انتہا پسندی کے جواب میں جب مسلم جماعتوں کی طرف سے انتہا پسندی اور مظالم سامنے آئے بلکہ خود امریکہ و یورپ کی خفیہ ایجنسیوں نے ان میں اپنے ایجنٹ داخل کیے جنہوں نے ان کے اشارے پر ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا تو ان کے پرشور اور مہیب پروپیگنڈے نے آسمان سر پہ اٹھالیا کہ مسلمان اور ان کی اسلامی جماعتیں (القاعدہ داعش وغیرہ) انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ خلافت کی داعی داعش انتہا پسندی اور دہشت گردی میں ملوث ہے (اور ہم اس کی مذمت بھی کرتے ہیں اور اسے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں خود داعش کے لیے بھی باعث ضرر سمجھتے ہیں) لیکن سوال یہ ہے کہ داعش کو جنم کس نے دیا اور اس کو انتہا پسندی پر مائل اور مجبور کس نے کیا؟ اور اس کا ایک ہی جواب ہے کہ عراق میں امریکہ اور اس کی پالیسیوں نے.....لیکن امریکہ کی مذمت کوئی نہیں کرتا۔ اور امریکہ کی ابلیسی سازشیں دیکھیے کہ وہ مسلمانوں کو خود تو مارتا ہی ہے وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑاتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے لڑیں، دونوں طرف سے مسلمان مریں، ان کے گھر جلیں اور ان کے ملک برباد ہوں۔ اس نے کیمیائی ہتھیاروں کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے عراق پر حملہ کیا، نیم ایٹمی ہتھیار استعمال کر کے اس پر قبضہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر اہل تشیع کو حکومت دے دی جنہوں نے سنی مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی اس نے ایسے ہی کیا کہ خود مقامی لوگوں پر ڈرون حملے کرتا تھا اور پاکستانی فوج کو بھی ان پر چڑھائی کے لیے دباؤ ڈالتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس امریکی دہشت گردی کے جواب میں یہ مظلوم لوگ پھول کیسے برسائیں؟ بالآخر مظلوم بھی ردّعمل کا شکار ہو کر ظلم پر اتر آتا ہے۔

ہم نے حقائق کا یہ تجزیہ اس لیے کیا ہے تاکہ لوگ صحیح صورت حال کو سمجھ سکیں اور انہیں پتہ چل جائے کہ اصل ظالم، انتہا پسند اور دہشت گرد مغرب (امریکہ و یورپ) ہے اور مسلمان جو کچھ کر

رہے ہیں وہ محض ان مظالم کا ردعمل ہے۔لیکن ہماری ذاتی رائے میں مسلمان جماعتوں اور تحریکوں کو پھر بھی انتہا پسندی سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے عالم کفر کو اسلام کے خلاف جارحانہ پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملتا ہے اور مسلمانوں کو مطعون کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔وہ کفر کا مقابلہ ضرور کریں لیکن دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ردّعمل کا شکار نہ ہوں۔عقل مند، شائستہ، حلیم اور صاحبِ فراست لوگ گالی دینے والے کو گالی نہیں دیتے بلکہ یا تو اسے معاف کر دیتے ہیں یا کسی مناسب موقع محل پر اس سے اتنا ہی بدلہ لے لیتے ہیں۔

ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ خلافت قائم کرنا ان کا حق ہے اور وہ یہ ضرور قائم کریں لیکن مغرب کے رویے سے مشتعل ہونے کی بجائے وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیں، منصوبہ بندی اور حکمت عملی سے کام کریں۔مغرب کی انتہا پسندی کا جواب انتہا پسندی سے نہ دیں۔

اگر موضوع کا رخ اس طرف ہو ہی گیا ہے تو ہم اسے سمیٹنے سے پہلے ان مسلم سیاسی و جہادی تنظیموں سے 'الدین النصیحہ' کے پیش نظر دو باتیں کہنا چاہتے ہیں جو خلافت کے احیاء اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں کہ وہ اپنی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے تین امور پر زیادہ توجہ دیں۔**ایک** تعلیم کتاب وحکومت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے افراد کی تعمیر سیرت کے کام کو وہ بنیادی اہمیت دیں۔ **دوسرے** تعلیمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ابلاغی.....شعبوں میں نہ مغربی فکر وتہذیب کے اثرات اور پیروی سے بچیں۔وہ اپنے افراد کی ایسی تربیت کریں اور اپنا انتظامی ڈھانچہ اتنا مضبوط رکھیں کہ اس میں مغربی خفیہ ایجنسیوں کو نقب لگانے کا موقعہ نہ ملے تاکہ ان کی سازشوں اور ان کے شر سے بچا جا سکے۔

تیسری اور آخری بات یہ کہ ان کا طریق کار خواہ دعوت واصلاح ہو، خواہ سیاسی جدوجہد ہو اور خواہ مسلح جہاد ہو وہ آپس میں مل جائیں، باہم اخوت ومودت کا اسلوب اپنائیں، مسلم معاشروں میں یکجہتی اور ہم آہنگی کو فروغ دیں اور اتحاد امت کے خواب کو شرمندہ تعبیر کریں لیکن جب دشمن کا سامنا ہو تو اس کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جائیں بقول اقبال ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ڈاکٹر علی شریعتی. ڈائیلاگ

محمد عمران خان☆

ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کا تقابلی جائزہ(۲)

اسلام کا تصور انسان

مغرب کے مقابلے میں اسلام جس انسان کا تصور پیش کرتا ہے وہ ایک مکمل انسان ہے جو کہ ہر قسم کی تقسیم سے پاک ہے اور وہ روحانی انسان کا تصور ہے جو صدیوں سے قائم ہے اور چلا آرہا ہے۔ اسلام انسان کو ایک کلیت میں دیکھتا ہے اور اس کے شعور کی تمام سطحوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے جبکہ مغرب میں کسری انسان کا تصور پروان چڑھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل تقسیم در تقسیم ہوتا چلا جارہا ہے مثلاً عقلی انسان، افادی انسان، جذباتی انسان، سیاسی انسان، جبلی انسان اور یہ کہ اس تقسیمی عمل سے انسان اپنی انسانیت سے محروم ہوگیا۔ (اسلام اور مغربی فکر وتہذیب: اصطلاحات وتصورات کا ایک تقابلی جائزہ از ڈاکٹر محمد امین)

یہاں یہ بات اہم ہے کہ اصلِ انسانی ''عبدیت'' ہے یعنی انسان اللہ کا بندہ ہے اور اس کی حقیقت اس سے کہیں باہر (objective) نہیں بلکہ اس کے اندر ہے یعنی ایسا ممکن نہیں کہ انسان اپنی عبدیت کو اپنے وجود سے علیحدہ ہوکر بھی سمجھ سکتا ہے (جیسا کہ سائنس کے تصور معروضیت کا تقاضا ہے) بلکہ ''عبدیت'' ہی اس کا اصل جوہر ہے۔ اور اس بات کا ادراک کرنے کے لئے رسوم بندگی کی ادائیگی لازمی ہے۔ اس کے برعکس جدید اعتزالی تصور کے مطابق انسان اصلاً ''عبد'' نہیں بلکہ ''آزاد'' (autonomous) اور قائم بالذات (گویا الصمد self determined) ہے یعنی جدید اعتزال کی رو سے انسان عبد نہیں بلکہ human ہے۔ صراحتاً عرض ہے کہ سیکولرازم اس بات پر شدومد سے زور دیتا ہے کہ عادلانہ معاشرتی تشکیل کے لئے ہمیں ''انسانیت'' کی سطح پر سوچنے کی ضرورت ہے نہ کہ کسی خاص مذہب، رنگ، یا نسل کی بنیاد پر۔ یعنی معاشرہ کی بنیادی مشترکہ اساس ''انسانیت'' (Humanism) ہے یہی اعلیٰ ترین اور مشترک بنیادی قدر ہے۔ اور اسی وجہ سے ہیومن رائٹس کے نام پر دنیا میں ایک متوازی مذہب ایجاد کرلیا گیا ہے۔ سیکولر حضرات اپنے دعوے کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے سوال اٹھاتے ہیں ''آیا پہلے اور اصلاً ہم انسان ہیں

☆ کراچی Imrann2010@gmail.com

یا مسلمان''عمومی جواب یہی دیا جاتا ہے کہ پہلے ہم انسان ہیں پھر مسلمان۔ گویا مسلمان ہونے کے لئے پہلے انسان ہونا ضروری ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے انسانیت ہے پھر مسلمانیت۔ اسی وجہ سے وہ مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ بنالیتے ہیں اور زیادہ معقول بات بھی ان کے نزدیک یہی ٹھہرتی ہے کہ اجتماعی نظام کی بنیاد اسی اصل یعنی انسانیت پر قائم ہونی چاہیے۔

جبکہ اس کا واضح اور قطعی جواب یہ ہے کہ میری اصل مسلمان (بمعنی عبد) ہونا ہے جبکہ انسان ہونا محض ایک حادثہ اور میری مسلمانیت (عبدیت) کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔یعنی میری اصل عبد یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونا ہے، میں انسان سے پہلے ایک ''مخلوق'' ہوں جس کا کوئی خالق ہے جبکہ میری انسانیت ایک حادثہ اور اتفاقی امر ہے، گویا میں اگر انسان نہ ہوتا تو جن یا فرشتہ ہوتا یا حیوانات، جمادات یا نباتات کی اجناس سے میرا تعلق ہوتا۔ میں کچھ بھی ہوتا، ہر حال میں مخلوق ہوتا، یعنی اپنے وجود کی ہر ممکنہ صورت میں میری اصل مخلوق (عبد) ہونا ہی ہوتی، یہ اور بات ہے کہ میری عبدیت کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا مثلاً میں پودا ہوتا تو میری عبدیت کا اظہار پودا ہونے میں ہوتا، اگر میں فرشتہ ہوتا تو یہ ملکوتیت میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ بنتی اور جب میں انسان ہوں تو میری انسانیت میری عبدیت کا ذریعہ ہے۔ الغرض میرا ''حال'' (جن، فرشتہ، حیوان و نبات و جمادات) تو تبدیل ہوسکتی ہے لیکن میرا مقام (status) بہر حال مخلوق (عبد) ہونا ہی رہے گا۔ میرے وجود کی ہر حالت میرے لئے ان معنوں میں اتفاقی ہے کہ میں اپنی کسی حالت کا بھی خود خالق نہیں ہوں بلکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے جس حالت میں چاہا مجھے میری مرضی کے بغیر تخلیق کر دیا نیز وہ اس بات پر مجبور نہ تھا کہ مجھے انسان ہی بناتا (یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت بنیادی انسانی اعضاء (دل، آنکھ، کان وغیرہ) کے عطا کرنے پر بھی انسان سے شکر گزاری کی توقع کرتا ہے) جب یہ ثابت ہوگیا کہ میری حقیقت عبد ہونا ہے اور میری انسانیت محض میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ ہے تو یہ سمجھنا بالکل آسان ہوگیا کہ میری انسانیت کا وہی اظہار معتبر ہوگا جس میں عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ میری خود کی مرضی اور نفس پرستی۔ اور چونکہ میری عبدیت کے اظہار کا واحد ذریعہ صرف اور صرف اسلام ہے لہذا میری انسانیت معتبر تب ہی ہوگی جب میری زندگی کا ہر گوشہ اسلام کے مطابق ہو۔ گویا انسان اپنے ہونے کا جواز اور پہچان اللہ سے حاصل کرتا ہے (جدید اعتزال کے فکری ابہامات کا جائزہ از زاہد صدیق مغل، محدث، مئی 2009)۔ ارشاد ربانی ہے:
''جس نے نہایت خوب بنائی جو شے بھی بنائی اور انسان کی بناوٹ مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی

نسل ایک بے وقعت پانی کے نچوڑ سے چلائی۔ جسے ٹھیک ٹھاک کر کے اس میں اس نے روح پھونکی۔اسی نے تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے (اس پر بھی) تم بہت ہی تھوڑا احسان مانتے ہو(السجدہ32:7-9) نیز (التین 4:95)۔لہٰذا میری عبدیت وانسانیت ہر دو کا تقاضا ہے کہ میں اس کی بندگی کروں اور اس کا شکر بجالاتا رہوں۔

جدید مفکرین کا تصور انسان وکائنات

مغربی مفکرین نے انسان کو اس کی حیوانیت یا رذائل کی بنیاد پر دریافت کیا مثلاً: میکڈوگل انسان کو حیوانی جبلتوں کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔سگمنڈ فرائڈ مغلوب الشہوت حیوان اور فرائڈ کا شاگرد ایڈلر احساس تفوق کا مجسمہ کہتا ہے۔ارسطو کے مطابق وہ دوٹانگوں والا جانور ہے۔روسو کے مطابق انسان ایک وحشی ہے۔ ہابز کی رائے ہے کہ انسان دوسرے انسان کے لئے بھیڑیا ہے۔ہیوم انسان کو بدمعاش تصور کرتا ہے۔سارتر کے بقول انسان ایک ایسا جانور ہے جسے عقل و خرد سے بیگانہ بنا کر دنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔لہٰذا ایسا انسان جو مبینہ رذائل کا حامل ہوگا تو نتیجتاً ایسا ہی سماج بھی تشکیل دے گا جو حیوانیت کی سطح پر جینے والا اور اخلاق باطلہ کا خوگر ہو۔اور اگر اس کے برعکس یہ باور کیا جائے کہ انسان بنیادی طور پر اخلاقِ حسنہ کی غالب صفات کا حامل ہے اور نفسانی محرکات سے نمٹنے کے لئے اس کے پاس الوہی رہنمائی ہر لحظہ میسر ہے تو اس سے جو معاشرہ تشکیل پائے گا وہ 'توحیدی واعلیٰ انسانی صفات وکمالات' کا نمونہ ہوگا۔

گورچیف کہتا ہے: 'یہ ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کئے بغیر کائنات کا مطالعہ کرسکیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ، کائنات کے مطالعہ کے بغیر کرسکیں۔انسان تو کائنات کا عکس ہے''۔انسان اور کائنات کے تعلق کا تعین دونوں کے تصورات اور حیثیتوں سے ہوگا ۔دور حاضر کی سائنسی فکر نے ایک نئی طرح ڈالی ہے اور وہ ''تسخیر کائنات'' کی ہے۔اس فکر کی رو سے کائنات انسان کے مدمقابل اور نقصان دہ ہے لہٰذا اسے کنٹرول کرنا اور مسخر کرنا انسان کے مفاد میں ہے۔تسخیر کائنات کے فلسفے نے انسان کو وسائلِ کائنات کے استحصال کا زبردست موقعہ اور داعیہ دیا ہے لیکن اس استحصال کا نتیجہ ماحول کے عدم توازن کی صورت میں انسان پر مسلط ہے۔ Global Warming ہو یا Ecosystem کی تباہی، انسانیت کے لئے مسائل پیدا کر رہی ہے۔۔''کائنات کی پرستش کا قدیم تصور'' اور ''کائنات کی تسخیر کی جدید فکر'' دونوں غیر متوازن ہیں

دونوں سے انسان کو مجموعی طور پر نقصان ہی پہنچا ہے۔

قرآن اس تصور کو تسلیم نہیں کرتا کہ کائنات اور انسان ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں بلکہ اسے انسان کے لئے مسخر کیا گیا ہے اور اسے انسان کی منفعت کے لئے بنایا گیا ہے۔ انسان اور کائنات میں تصادم نہیں توافق ہے۔ انسان کو کائنات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دینے سے منشاءِ ایزدی یہ ہے کہ انسان اپنے رب کو اس کی نشانیوں سے پہچانے، اپنے مقام کا ادراک کرے، اپنے اختیار وارادہ سے کائناتی نظام سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے اطاعت و بندگی رب پر چلے۔ خلق لکم مافی الارض جمیعا (البقرۃ2:29) اور الم تر ان اللہ سخر لکم مافی الارض (الحج22: 65)۔ قرآن کائنات میں غور وفکر کی دعوت تصرف فی الارض کے لئے نہیں دیتا، بلکہ اس کا اصل مقصد معرفت ربانی، کائنات کی حقیقت اور آخرت کی یاد دلانا ہے۔ نیز اس غور وفکر کے نتیجہ میں انسان ''عبد'' بنتا ہے اور رب کے حضور سجدہ ریز ہوجاتا ہے نہ کہ خود معبود بننے کا اعلان کر کے الوہیت انسانی کا فلسفہ پیش کرتا ہے (یاد رکھنا چاہئے کہ جدید مغربی مفکرین کے پاس الوہیت عیسیٰؑ کی مذہبی روایت کے بیج موجود رہے ہیں جس نے انسان کو خدائی مقام دلانے میں ان کے لیے جواز کا کام دیا) موں تینیہ (Montaigne1533-1592) کہتا ہے انسانی ذہن کی معراج معرفت یا علم کا حصول نہیں بلکہ تشکیک (Skepticism) ہے اس فکر کا معروف نمائندہ رینے ڈیکارٹ (Rene Descartes1596-1650) بھی رہا۔ دور حاضر کے انسان کے غلط تصور انسان اور کائنات کے نتیجے میں ان کے درمیان شدید عدم ہم آہنگی نے جنم لیا ہے جس کی جانب پاپ فرانسس نے بھی اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا (دی گارڈین 15 جون 2015)۔

3۔ علی شریعتی کا تصور آزادی

علی شریعتی جب مختلف جکڑ بندیوں سے انسان کی آزادی کا بیان کرتے ہیں تو اس سے علی شریعتی کی مراد ایران کا وہ دور ہے جو کہ غالباً 1950ء تا ان کی وفات 1977ء پر محیط ہے۔ ایران کا یہ دور سیاسی عدم استحکام و غیر یقینی پن، مذہب (شیعہ ازم) کے جدیدیت سے ٹکراؤ، سوشلزم و سرمایہ دارانہ نظام کے مابین جاری کشمکش کا منتہائے کمال، اقتصادی بدحالی اور سماجی بے چینی وانتشار کا تھا (جنگ عظیم دوم کے مابعد کا یہ دور سامراج کے کمزور پڑنے اور اس کی مسلم کالونیز کے آزاد ہونے کا بھی ہے)۔ صفوی دور (1736-1501ء)، جن کا سرکاری مذہب اثنا عشری تھا

اوراسی دور میں روسی اثرات کا ایران میں آغاز ہوا جو قاچاری دو (1925-1794ء) تک باقی رہا تاہم اکتوبر 1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعد روس کی ایران پر گرفت کمزور پڑ گئی۔ پہلوی دور (1979-1925ء) جو کہ ایرانی بادشاہت کی آخری نشانی تھا، اس کے بانی رضا شاہ پہلوی (1941-1925ء) نے روسی اثر ورسوخ کو روکا اور ایران میں امریکی مفادات وجدیدیت کا علمبردار بنا۔ یہاں امریکی کارپوریٹ ورلڈ کے ایک سابقہ اہلکار John Perkins کے اعترافات پر مبنی کتاب کا ایک اقتباس جو کہ شاہ کے سفید انقلاب (White Revolution) کی بابت ہے، برمحل ہوگا: وہ لکھتا ہے ''اسے وہ اور ہم سفید انقلاب کہتے ہیں۔ یہ پروگرام بظاہر وسیع سماجی اور اقتصادی اصلاحات کا حصہ دکھائی دیتا ہے میں اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہم اپنے دل میں جانتے تھے کہ یہ سب لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے یہ White Revolution نہیں بلکہ ایک Whitewashed Revolution تھا جو شاہ کے اقتدار کو بڑھاوا دینے کا ایک حیلہ تھا۔ بظاہر ایران مسلمان اور عیسائیوں کے مابین تعاون کی ایک مثال تھا لیکن دراصل یہ مشرقِ وسطیٰ پر امریکی بالادستی کی ایک مثال تھا''۔

علی شریعتی کے مغربی مفکرین ومستشرقین سے دین اخذ کرنے کے باعث اس کا تصورِ مذہب (خصوصاً شیعیت) مروجہ شیعیت سے مختلف شکل اختیار کر چکا تھا لہذا وہ روایتی شیعی علماء کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا، اور اب تک کی علی شریعتی کی حکومت مخالف سرگرمیوں کے باعث وہ اہل اقتدار کے لئے بھی دردسر بنے ہوئے تھے۔ گویا وہ ایران کی مذہبی وسیاسی اور سماجی مسلمہ روایات واقدار سے اپنا تعلق منقطع کر چکے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ ایران میں معقول مقبولیت کے باوجود انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ماہ وسال پیرس میں گوشہ گمنامی میں بسر کیے۔ وہ درحقیقت مستشرقین کی مستعار فکر کے تحت روایتی مذہبیت سے اور مغربی فلسفیانہ فکر کے تحت سامراج اور مروجہ ایرانی سیاست وسماجی روایات سے ایرانی عوام کو گلوخلاصی دلانے کے خواہاں تھے اور اسی فکر سے ان کے تصور آزادی نے جنم لیا۔

4۔شریعتی اور تصور بغاوت

بغاوت کی اصطلاح سے یہ تاثر پیدا ہونا فطری ہے کہ فریق اول (حاکم) کو فریق

ثانی (باغی) پر قدرت وتسلط حاصل نہیں یا کم ازکم فریقین میں توازن طاقت Balance of power میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔شریعتی کے بقول: فرانسیسی مفکر البرٹ کیموس Albert Camus (1913-1960ء) نے کہا کہ میں بغاوت کرسکتا ہوں اس لیے میں ہوں۔کیموس نے جو بات کہی وہ زیر بحث موضوع کے حوالے سے اہم تر ہے۔۔پس یہ انسان ہے جو شعور رکھتا ہے اوراس بناء پر جنت بلکہ خدا کے خلاف بغاوت کرسکتا ہے۔۔کیموس کی بغاوت کا یہی مطلب ہے خواہ وہ بغاوت کسی سماجی نظام کے خلاف ہو یا اپنی فطرت کے (بحوالہ: اسلام اور تصور انسان؛ البرھان اپریل 2015 ص:22-21)، کیموس جو کہ وجودی مفکر پال سارتر کا گہرا دوست تھا۔ اس کی تصنیف *The Rebel*، الہیاتی اور تاریخی ہر دو سطحوں پر سماجی بغاوت کا بیان ہے۔

مسیحیت اور جدید مفکرین کا تصور بغاوت

عیسائیت میں شیطان کو خدا کے مدمقابل اور ہم سر تصور کرتے ہوئے خدا کا دشمن (God's enemy) باور کیا جاتا ہے۔جو چاہتا ہے کہ:

I will ascend above the stars of God. I will (میں خدا کی مانند بنوں گا) set my throne on high..I will make myself like the Most High (Isaiah14:12-15)۔

نیز PBCI راولپنڈی کی مطبوعہ The Living & True God کے ص:22 پر مصنف لکھتا ہے:

Satan reblled against the living and true God. He also succeeded in tempting **Adam and Eve to disobey** God.

پادری ڈاکٹر آرتھر جیمس اپنی تصنیف مسیحی علم الکلام کے لزوم کے ص 133 پر لکھتے ہیں: وہ (گناہ) کا بانی ہے اور گرے ہوئے باغی فرشتوں اور روحوں پر حکمرانی کرتا ہے'' گویا شیطان نے خدا کے خلاف بغاوت کی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی علم الکلام میں اس ''شیطانی'' بغاوت کا تصور نظری طور پر ہی سہی شیطان کو خدا کے ہم پلہ یا مدمقابل ماننے سے متشکل ہوا۔(جبکہ یہودیوں کے ہاں شیطان، خدا کا نہیں انسان کا دشمن تھا) اور یہ کہ عیسائیت میں انسان (آدم وحوّا) کو ''نافرمان'' باور کیا جاتا ہے نہ کہ ''باغی'' جیسا کہ محولہ بالا بیان اور کتاب مقدس (بائبل) مطبوعہ

پاکستان بائبل سوسائٹی، تیسرے باب (کتاب پیدائش 3: 1-24) کا عنوان قائم کیا گیا ہے ''انسان کی نافرمانی''۔لیکن بعدازاں ''اصلاح مذہب'' نشاۃ ثانیہ اور تحریک تنویر کے تحت مغربی مفکرین نے مسیحی تصور شیطان کی خدا سے بغاوت کو انسان کی خدا سے بغاوت سے منسوب کر دیا اور یہ بغاوت درحقیقت خدا اور اس کی شریعت (مسیحی) کے خلاف تھی جس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اسے قرون وسطیٰ کے تمام افکار ولوازمات تک بڑھا دیا گیا۔اور اسی تصور بغاوت کو علی شریعتی نے ان مغربی کرم فرماؤں سے اخذ کیا اور اسلام کے تصور انسان میں اسے اپنی فکر کے طور پر پیش کر دیا۔

محققین کا کہنا ہے کہ شیطان کو خدا کی ضد یا دشمن خیال کرنے کا تصور زرتشت مت (مجوسیت Zoroastrianism) سے عیسائیت میں داخل ہوا جہاں Ahura Mazda (آہورمزدا یا یزداں) اور Aura Mainyu (اہرمن Ahriman)۔دو خدا (خیر وشر) ہو گئے۔ نیز چونکہ مسیحیت میں حضرت عیسیٰؑ (Jesus Christ) کو God incarnate (خدا انسانی شکل میں۔اوتار۔نظریہ تجسیم) تصور کیا جاتا ہے۔نیز یہ بھی کہ خداوند یسوع مسیح کو شیطان کے ذریعہ بیابان یا جنگل میں آزمایا بھی گیا تھا (متی 4:1-11؛ مرقس 1:12-13؛ لوقا 4:1-13)، اس لیے بھی مسیحیوں کے لئے شیطان کو خدا کے برابر یا ہم پلہ ماننے کے سوا چارہ نہ رہا ہوگا۔

اسلام اور یہودیت میں تصور بغاوت

جبکہ حقیقت یہ ہے جو نہ صرف نقل بلکہ عقل کی کسوٹی پر بھی پوری اترتی ہے کہ انسان وشیطان دونوں ہی خالق کائنات کی ادنیٰ مخلوق ہیں۔مسلمان و یہودی شیطان کو اللہ کا دشمن یا باغی نہیں بلکہ ''نافرمان ومتکبر'' یقین کرتے ہیں ہاں وہ انسان کا دشمن ضرور ہے جس نے انسان کو بھی نافرمانی پر اکسانے میں اہم کردار ادا کیا۔آدمؑ وحواؑ کا ممنوعہ پھل نوش کر لینا باغیانہ فعل نہ تھا بلکہ شیطانی وسوسہ اور اولوالعزمی میں کمی کا نتیجہ تھا (طٰہٰ 20:115-123)۔اور یہ کہ اسلام میں باغی اور بغاوت ایک ''سیاسی'' اصطلاح ہے اور ایک ایسے شخص کے لئے مستعمل ہے جو ملکی قوانین پس پشت ڈال کر اطاعت امیر سے روگردانی کرتا ہے۔یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام میں شیعیت اور بغاوت وخروج کے واقعات زیادہ نظر آتے ہیں۔

5۔علی شریعتی کا تصور خودکشی اور خودغرضی

علی شریعتی کا کہنا ہے: ''انسان اپنی 'خودغرض' فطرت کے باوجود خودکشی کر سکتے ہیں''۔اس

سے وہ یہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ انسان فطری احتیاجات کے خلاف بغاوت کرسکتا ہے(بحوالہ: البرھان اپریل2015،ص:22)۔ اس کے برخلاف نامور ماہر سماجیات ایمائیل ڈرخائم Emile Durkheim(1858-1917ء) جو اپنے خودکشی کے نظریہ کے حوالہ سے مشہور ہے،خود کشی کی تین اقسام گنواتا ہے: (۱) انائی خودکشی (۲) غیر معمولاتی خودکشی (۳) ایثارانہ خودکشی۔ انائی خودکشی (Egoistic Suicide) کے حوالہ سے لکھتا ہے: ''اس خودکشی کا ارتکاب کرنے والا فرد اپنی ذات کے خول میں رہنے لگتا ہے اور صرف اور صرف اپنی ذات کے متعلق سوچتا ہے۔۔ایسا عموماً جدید معاشروں (Modern Societies) میں ہوا کرتا ہے۔خودکشی کی اس قسم کو''خود غرضانہ یا انائی خودکشی'' کا نام دیا جاتا ہے(یہاں علی شریعتی کی جدید مغربی فلسفہ سے متاثر ہوکر خود کشی کے ارتکاب کی کوشش کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے)۔ ماہرین کے مطابق خودکشی کی عمومی وجوہات: ڈپریشن، ناامیدی، فرسٹریشن، خوف، دماغی عارضہ(مثلاً Schi zophrenia)، ماضی کے تلخ تجربات ہیں۔ان زمینی حقائق سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ خودکشی کی عمومی وجہ فرد کے اپنی ذات کے خول میں بند ہوجانے کا نتیجہ ہے۔گویا علی شریعتی کا خودکشی کو خودغرضانہ فطرت کے تضاد کے طور لینا غلط فہمی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ خودکشی کی اصل وجہ''خود غرضی''ہی ہے۔

6۔علی شریعتی کا تصور انتخاب واختیار اور تقدیر کی مختصر وضاحت

علی شریعتی لکھتے ہیں ہمہ اوست (وحدت الوجود pantheism۔یعنی یہ کائنات خدا اور خدا ہی کائنات) کا نظریہ مذہبی پس منظر کا حامل ہے اور بعض مسلم صوفیاء، ہندو کیتھولک عیسائی اس میں یقین رکھتے ہیں یہ الہیاتی جبریت بھی انسانی حق انتخاب مجروح کرتی ہے۔کیتھولک عیسائی اور مسلمان بھی کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے اگر یہ صحیح ہے تو انسان کا حق انتخاب بے معنی ہوجاتا ہے(البرھان، اپریل 2015ء،ص: 24-25)۔یاد رہے دنیا کے ہر مذہب میں ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا تصور کسی نہ کسی شکل میں اختیار کیا گیا،خصوصاً ہندومت میں اس کی واضح مذہبی بنیادیں موجود ہیں۔ ہمہ اوست کی وضاحت کرتے ہوئے حافظ محمد شارق اپنی تصنیف ہندومت اور اسلام (جلد اول،ص:80) میں لکھتے ہیں: ادویت (Pantheism) کا تصور ہندوؤں میں اپنشدانہ خیالات کے تحت ہوا ہے۔اپنشد میں خدا کو پہچاننے کے لئے جس تعلیم کا سہارا لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات میں تمام مظاہر کی حقیقت ایک خدا ہی ہے جسے وہ''آتمن یا

برہمن یا برہما'' کا نام دیتے ہیں۔ ہر شے چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، مقدس اور الہامی ہے کیونکہ اس میں خدا کا ظہور ہے (مثلاً بھگوت گیتا: باب 7: اشلوک 8-11)۔

اسلام میں تصور تقدیر

حدیث جبریل میں ہے.....اس (جبرائیلؑ) نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ایمان یہ ہے کہ تم خود اللہ تعالیٰ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس سے ملنے کا اور اس کے پیغمبروں کا یقین رکھو، حشر کو سچا جانو اور ہر طرح کی تقدیر الٰہی کو خواہ وہ خیر ہو یا شر، دل سے مانو۔ اس نے کہا آپؐ نے سچ فرمایا (حدیث جبرئیل) (صحیح مسلم: کتاب الایمان، حدیث ۹۳؛ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)۔ قدریہ (تقدیر کے منکرین) کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں (اللہ کی قسم)، اگر وہ احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کریں تو تقدیر پر ایمان لائے بغیر (اللہ کے ہاں) قبول نہیں ہوتا (صحیح مسلم)۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی، مسئلہ جبر وقدر میں مختلف افکار ونظریات کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں ''فلاسفہ مغرب کا رجحان جبریت کی طرف رہا ہے۔ سائنس کا رجحان ہمیشہ سے ہی جبر کی طرف رہا ہے۔ اخلاقیات میں اظہار وکردار پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے نہ کہ پوشیدہ اسباب وعلل پر۔ علم الاخلاق جبر وقدر کے مابین فیصلہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ دینیات (Theology) میں یہ مسئلہ فلسفیانہ انداز کا ہے۔ قرآن حکیم میں تقدیری امور میں جو اشارات کیے گئے ہیں وہ راز حقیقت بتانے کی بجائے ان مقاصد کو مدد پہنچانے کے لئے ہیں جن کا تعلق انسان کے اخلاق اور عملی مفاد سے ہے۔ قضا وقدر کے مسئلہ پر جو اشارات کلام اللہ میں آئے ہیں ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں قناعت، یکسوئی، توکل علی اللہ، صبر واستقامت اور دنیوی طاقتوں سے بے خوفی پیدا کی جائے اور اس میں ایسی اخلاقی قوت بھر دی جائے جس کی موجودگی میں مایوسی، پریشانی، خوف، لالچ، اس کے پاس پھٹکنے نہ پائے اور وہ اس کے ذریعہ سے حق وصداقت اور نیکی کے طریق پر قائم رہے، اس کی طرف دوسروں کو دعوت دے اس کی خاطر دوسروں کو دعوت دے اس کی خاطر سخت سے سخت مشکلات کا مقابلہ کرے، اس راہ میں جتنی آزمائشیں آئیں ان میں ثابت قدم رہے۔ نہ خدا کے سوا کسی سے مضرت پہنچنے کا اندیشہ کرے، نہ بے سروسامانی میں ہمت ہارے، نہ سروسامان پر بے جا اعتماد کرے، نہ زندگی کی ناکامیوں پر شکستہ خاطر ہو اور نہ کامیابیوں پر مخمور ہو کر سرکشی پر اتر آئے۔ گویا اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول یا مطلوبہ نتائج پیش نظر ہیں۔ (جاری ہے)

کس قیامت کے یہ نامے سید خالد جامعی ☆

جدیدیت کے خلاف علمی جدوجہد کی ضرورت واہمیت

خالد جامعی صاحب اوران کے رفقاء کی کاوشیں اور علمی منصوبے

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب!

جولائی کے البرہان میں ہمارے شاگرد رشید جناب ظفر اقبال صاحب کی کتاب پر آپ کا مختصر تبصرہ کا ذکر ایک دوست نے کیا اور کہا امین صاحب نے آپ پر تنقید کی ہے۔ رسالہ کا مطالعہ کئے بغیر راقم نے عرض کیا: امین صاحب اس امت کے مخلص خادم اور راقم سے بہت محبت رکھنے والے بزرگ ہیں۔ اگر انہوں نے تنقید کی ہے تو درست ہی کی ہوگی۔ ان کا فون بند ہوا تو رسالہ بھی ڈاک سے مل گیا اور آپ کی بے لاگ اور سو فی صد درست تنقید بھی مطالعے میں آئی۔ آپ نے بجا لکھا ہے کہ قوت ابلاغ میں مشیت نے کسر رکھی اور وہ ذات اپنے فیصلوں کی حکمت کو خود ہی بہتر جانتی ہے [البرہان جولائی ۲۰۱۵ء ص ۲۷]۔ حقیقت یہی ہے جو آپ نے بیان کی لیکن یہ اس رب کی مشیت ہے کہ اس نے ہمیں جناب ظفر اقبال صاحب اور جناب عبید صاحب جیسے دو مخلص باصلاحیت اور صاحب علم شاگرد بھی مہیا کئے جو ہمارے موضوعات، مباحث، نقطۂ نظر، خیالات و افکار اور تحقیقات کو ہم سے زیادہ بہتر، اعلیٰ، برتر اور نفیس طریقے سے پیش کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر، علم، صلاحیتوں، اوقات میں برکت عطا فرمائے اور ان سے وہ کام لے جو ہم جیسے ناکارہ خستہ حال لوگ تمام صلاحیتیں ہونے کے باوجود نہیں کر سکے۔

ہماری خواہش ہے ظفر اقبال صاحب اور عبید صاحب جیسے چند اور نوجوان جدیدیت، مغربیت، لبرل ازم، سرمایہ داری اور انسانی حقوق کو اپنی دلچسپی کا موضوع بنائیں تو مغربیت یعنی فلسفۂ جدید کے کفریات کے خلاف ایک نئی ٹھوس علمی، روحانی، ایمانی تحریک برپا کی جاسکتی ہے۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ہماری خدمات حاضر ہیں۔

جدید سائنس وٹکنالوجی کے حوالے سے جناب ظفر اقبال صاحب کی پہلی کتاب 'اسلام اور

☆ ناظم تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی

جدید سائنس - نئے تناظر میں' اور ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے حوالے سے جدیدیت اور مغربیت کے نقد پر مشتمل ان کی دوسری 'کتاب اسلام اور مغربیت کی کش مکش' راقم الحروف اور محترم ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی براہ راست نگرانی میں لکھی گئیں۔ الحمدللہ! ان دونوں کتابوں نے امت کے علماء کی توجہ حاصل کی۔ ان مباحث پر یہ دونوں کتابیں اپنی نوعیت کی اہم کتابیں ہیں اور تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء کرام نے دونوں پر نہایت گراں قدر تبصرے کئے ہیں جن کے ذریعے ہمیں یہ یقین کامل حاصل ہوا کہ ہمارا کام امت کی مسلّمہ، متفقہ، مشترکہ علمیت سے ہم آہنگ ہے اور الحمدللہ! تجدد اور جدیدیت کے ہر رنگ سے پاک ہے۔ ہندوستان اور عالم عرب کے بہت سے علماء نے بھی ان مباحث کے عربی تراجم کے مطالعے کے بعد ان کی تائید فرمائی اور ان کتب کے ترجموں کی بھی استدعا کی۔

جن دنوں ماہنامہ 'ساحل' میں خطبات اقبال کے مباحث زور وشور سے جاری تھے اور اقبال اکیڈمی کے سہیل عمر صاحب اور احمد جاوید صاحب ان کے جوابات دینے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے تب ظفر اقبال صاحب نے 'ساحل' کے لئے ایک طویل خط لکھا جو شائع کر دیا گیا۔ اس خط کی اشاعت ملاقات کا ذریعہ بنی۔ جناب احمد نواز اعوان صاحب کے ذریعے ظفر صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ پہلی ملاقات میں ہی ظفر اقبال صاحب کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ اس وقت تک وہ حضرت امیر معاویہؓ پر ایک کتاب مرتب کر چکے تھے جس کا دیباچہ جاوید امیر عثمانی کے نام سے اقبال اکادمی کے ناظم جناب احمد جاوید صاحب نے لکھا تھا۔ مستقبل کے علمی منصوبوں سے متعلق استفسار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ مناظراتی ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں اور مختلف فِرقِ باطلہ کے خلاف "الملل والنحل" جیسا سلسلہ مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ راقم نے عرض کیا کہ وہ تاریخی مباحث، امت مسلمہ کے اندرونی اختلافات اور معاصر فرقہ آرائی کی بجائے جدیدیت اور مغربی فلسفے پر توجہ مرکوز کریں۔ امت کے اصل دشمن کو ہدف بنائیں۔ امت جب حقیقی دشمن کو پہچان لے گی تو معاصرانہ مذہبی کش مکش اور اختلافات صرف فطری صورت میں باقی رہ جائیں گے۔

تاریخی مباحث پر لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ عربی زبان میں اسلامی تاریخ پر بے نظیر کام ہو رہا ہے لہٰذا آپ فلسفے کی تحصیل پر متوجہ ہوں۔ الحمدللہ! اس مشورے کو انہوں نے تسلیم کیا۔ انہوں نے فلسفیانہ مباحث سے توحش کا اظہار کیا تو انھیں بتایا گیا کہ یہ توحش تو ایمان کا تقاضہ ہے۔ فلسفہ

ناگزیر برائی اور مخالفین کو انہی کے معیارات پر جوابات فراہم کرنے کا وہ طریقہ ہے جو امام غزالیؒ نے بتایا ہے۔فہم دین نہ فلسفے کا محتاج ہے نہ فلسفے پر منحصر، نہ فلسفہ کوئی قابل فخر علم ہے یہ جہالت خالصہ اور کفر ہے لیکن کفر کے مقابلے کے لئے ایک محدود دائرے میں اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس ایمانی رویے کے ساتھ اگر فلسفے سے تعلق قائم کیا جائے تو فلسفہ مخالفین کی علمی برتری کو انہی کے مسلمہ علمی اصولوں کے مطابق ردّ کرنے کا خوش گوار فریضہ انجام دیتا ہے اور ہمارے ایمان ویقین میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا۔انہوں نے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کیا اور فلسفے کا مطالعہ راقم اور استاد محترم ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی نگرانی میں شروع کیا۔جامعہ کراچی سے اوّل درجے میں پرائیویٹ امتحان دے کر ایم اے فلسفہ کی سند حاصل کی۔اب جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کررہے ہیں۔امید ہے ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا اور کام بھی بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا۔

ان دو کتابوں کے علاوہ ظفر اقبال صاحب راقم کی زیرنگرانی مندرجہ ذیل اہم موضوعات پر تالیف وتصنیف میں مصروف ہیں:

(۱) مغرب کے تمام بڑے مفکرین اور فلسفیوں کے کئی سوسوالوں پر مشتمل ایک حوالہ جاتی کتاب جناب ظفر اقبال صاحب راقم کی نگرانی میں براہ راست مرتب کررہے ہیں۔مختلف عنوانات، مباحث، موضوعات پر جمع کئے گئے یہ حوالے تمام مقررین، مصنفین اور محققین کے لئے قابل قدر علمی سرمایہ ثابت ہوں گے جنھیں وہ اپنی تحقیقات میں بھی شامل کر سکتے ہیں۔ان کی سافٹ کاپی بھی مہیا کی جائے گی۔وہ حوالے ہی ان شاءاللہ مخلص، باکردار اور باعمل جدیدیت پسند مفکرین کے لئے روشنی کے بے شمار دریچے کھول دیں گے۔

(۲) ترقی اور جدید سائنس کے حوالے سے عالم اسلام میں لکھے گئے سوسالہ لوازمے کا ایک تنقیدی جائزہ بھی ظفر اقبال صاحب راقم کی زیرنگرانی مرتب کررہے ہیں جس سے ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں دینی حلقوں کے سوالات کا شافی جواب میسر آئے گا۔اس کتاب کا دیڑھ دوسو صفحات پر مشتمل مقدمہ راقم نے تحریر کردیا ہے جو مطالعے کے لئے ظفر اقبال صاحب سے طلب کیا جاسکتا ہے یا راقم سے بھی۔

(۳) ظفر اقبال صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں عنقریب چھپ رہی ہیں: (i) لبرل ازم، (ii) آزادی، مساوات، ترقی، (iii) سول سوسائٹی، (iv) سرمایہ دارانہ نظام، (v) اجتہاد، اجماع (vi) امام غزالیؒ کا طریقۂ تنقید (vii) عقلیت کا تصور مذاہبِ عالم اور مذاہب فلسفہ میں،

(viii) جدید اسلام پر پروٹسٹنٹ ازم کے اثرات، (ix) جدید علم کلام کا ناقدانہ جائزہ، (x) برعظیم پاک و ہند میں فتویٰ نویسی اور مناظرہ بازی کی تاریخ، (xi) وحید الدین خان اور غامدی صاحب کے عقیدے (xii) بیسویں صدی کے پانچ اہم متکلمین کا علم کلام (xiii) مولانا ایوب دہلوی کی کلامی خدمات (xiv) عالم اسلام میں فکر اسلامی پر ابو الاعلیٰ مودودی، یوسف قرضاوی، علامہ اقبال، ڈاکٹر علی شریعتی، ڈاکٹر فضل الرحمان کے اثرات۔

عقائد نسفی اور **عقیدہ طحاویہ** کی شرح جدید بھی ڈاکٹر عبدالوہاب سوری اور راقم الحروف کی زیر نگرانی مرتب کی جارہی ہے۔ یہ کام جناب عبید صاحب اور ظفر اقبال صاحب انجام دیں گے۔ ڈاکٹر سفر الحوالی نے بھی جدیدیت کے عقائد پر اپنی شرح میں مختصر لکھا ہے مگر یہ کام تفصیل کا متقاضی ہے کیوں کہ امتوں کا اصل مقابلہ عقیدے اور علمیت کے میدان میں ہوتا ہے۔ جو تہذیب عقیدے اور علمیت کی جنگ ہار جائے، جس کا ایمان و یقین اپنے عقیدے، علمیت، مابعد الطبیعیات اور اپنی تاریخ پر سے اٹھ جائے وہ تہذیب اور اس کی وارث امت کبھی غالب نہیں ہوسکتی۔ اس کا عسکری غلبہ بھی علمی غلبے کے بغیر کارآمد نہیں ہوسکتا۔

تاتاریوں کا عسکری غلبہ کسی علمی برتری کے بغیر تھا لہٰذا وہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ مغرب سے اصل جنگ ایمان اور عقیدے کی جنگ ہے۔ مغربی عقائد اور مذہب انسانی حقوق کو علمی بنیادوں پر رد کیے بغیر یہ جنگ منطقی انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔ اگر ہم مغربی عقائد: آزادی، مساوات، ترقی اور اس مذہب کے ماخذ منشور انسانی حقوق کا علمی رد نہیں کریں گے تو ہماری فتح بھی شکست میں بدل جائے گی۔ عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ اس نے مغرب کا سیاسی اور عسکری مقابلہ تو بہت کیا ہے مگر اس کا علمی مقابلہ نہیں کرسکا۔ مغرب کے رد میں لکھی جانے والی تحریریں غیر شعوری طور پر مغرب کی علمیت، اس کے اداروں، اس کے مقاصد اور ارادوں کا ہی اثبات کرتی ہیں۔ مکتبہ روایت کا عظیم الشان علمی کام اس دعوے کا زندہ ثبوت ہے۔ اس فکر نے روایت کی بجائے جدیدیت کو ہی تقویت پہنچائی ہے۔ یہ اسلامی تاریخ، اسلامی علمیت، اسلامی روحانیت، اسلامی فن تعمیرات، اسلامی سائنس، اسلامی فنون عقلیہ کی تاریخ اور اس کے فروغ و احیاء کی بحث اٹھاتا ہے مگر اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا کہ ایک اسلامی ریاست کے وجود کے بغیر ان تمام امور کا احیاء، بازیافت اور فروغ کیسے ممکن ہے؟ اسلام کے سیاسی ہونے کا الزام اس مکتبۂ فکر کو ریاست، حکومت، سیاست، خلافت، کے مباحث سے لاتعلق کردیتا ہے۔ یہ بھی جدیدیت کی خاص علامت ہے اسی لئے اس مکتبۂ فکر کو مغرب میں اسلام کے لئے خطرہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کی بعض کتابوں

کے لئے استعماری ادارے بھاری مالی امداد مہیا کرتے ہیں۔ لہٰذا مغرب کا علمی بنیادوں پر رد وقت کا سب سے اہم ترین تقاضا ہے۔اس مقصد کے لئے مدارس عربیہ اور جامعات کے فاضلین کے لئے مختلف نصاب اور تعلیم وتدریس کے پروگرام بھی مرتب کئے جارہے ہیں۔تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والے احباب کے لئے عہد جدید کے مسائل، اس کے پیدا کردہ سوالات، شبہات، اشکالات کے حوالے سے معلومات، کتابیات، محاکمات، محاضرات، تنقیدات، حوالہ جات، ترجمہ اور تالیف کے اصولوں کی تدریس کا بھی سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔

جناب عبید صاحب نے منہج اہل سنت اور عقائد کے مباحث اور دارالحرب و دارالاسلام کے عنوانات پر آزادانہ طریقے سے نہایت قیمتی اور نفیس کام کیا ہے۔اسلامی علمیت کے باب میں یہ کام امت کی رہ نمائی کے لئے ایک علمی وروحانی دائرہ نور فراہم کرتا ہے۔اس کام سے ان کے تبحر علمی، توازن، خلوص، علوم دینیہ میں رسوخ، مغرب کے فلسفے سے واقفیت اور ان کی حمیت دینی کا اندازہ ہوتا ہے۔

عبید صاحب کا اپنا خاص رنگ ہے جو امت کی مسلمہ علمیت سے بہ انداز دگر اخذ واستفادہ کرتا ہے۔امید ہے کہ ان کی تحقیقات ان شاء اللہ تعالیٰ امام غزالیؒ، امام رازیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام شاطبیؒ، امام عزالدین عبدالسلامؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، النبراس علی شرح عقائد کے مؤلف علامہ فرہاری، مخدوم زین الدین مؤلف ''تحفۃ المجاہدین'' اور مؤلف رسالہ الثورۃ الھندیہ اور علامہ رحمت اللہ کیرانوی کی علمی روایت کا احیاء کریں گی ۔ بلوچستان کے مفتی صابر حقانی (۱) مکتبہ روایت، (۲) جدیدیت کے تین عقیدوں: آزادی مساوات اور ترقی (۳) مذہب انسانی حقوق (۴) مختلف تہذیبوں میں عدل کے مختلف تصورات پر ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کی زیرنگرانی کام کررہے ہیں۔امید ہے یہ سب کام امت کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔

ان کاموں کے باوجود راقم البرہان کے تنہا کام کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر امین صاحب نے تن تنہا مغربیت اور جدیدیت کے خلاف علماء اور دینی تحریکوں کے حلقے میں جو شمع روشن کی ہے اس کے اثرات کا اندازہ چند سالوں بعد ہوگا۔اس وقت پاکستان میں صرف البرہان، سہ ماہی جی، اور سرگودھا کا رسالہ المظاہر جدیدیت کا رد کرنے میں مصروف ہیں۔البرہان کی اتباع میں دیگر دینی رسائل بھی مسلسل مغرب کو مطالعے کا موضوع بنارہے ہیں۔ یہ مطالعات ابتدائی سطح پر کمزور ہوں گے لیکن مدیر البرہان نے جو کام شروع کیا ہے وہ ایک اہم اور نادر کام ہے۔اللہ تعالیٰ البرہان کے چراغ کو مینارۂ نور میں تبدیل کردے، اس کے معیار میں اضافہ کرے،

اس کے مباحث بہتر سے بہتر اور اس کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے اور اس کی روشنی ہمارے تمام تعلیمی، معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، تبلیغی، اصلاحی، فکری، دینی، علمی، جہادی حلقوں کو منور کر دے۔

جناب ظفر اقبال صاحب کی نئی کتاب پر فیس بک کے ذریعے دانستہ ایک بے بنیاد بحث شروع کی گئی کہ یہ کتاب ظفر اقبال صاحب کی ہے یا سید خالد جامعی کی۔ راقم یہ شہادت دیتا ہے کہ بلا شک وشبہ یہ کتاب جناب ظفر اقبال صاحب کی ہے البتہ اس کے مباحث، تحقیقات ماہ نامہ 'ساحل' کے ہزاروں صفحات میں بہ انداز دگر پیش کئے جا چکے ہیں لہٰذا لوگوں کو توارد کا گمان ہوا۔ یہ کتاب براہ راست میری نگرانی میں اور میری ہی تحریک پر تین سال کی محنت شاقہ کے بعد لکھی گئی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جناب نواز اعوان صاحب کراچی اور راولپنڈی کے ممتاز مفکر جناب شکیل عثمانی صاحب (سابق کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان) کے مشورے اس کتاب کی تیاری میں قدم قدم پر ہماری رہ نمائی کرتے رہے۔

واضح رہے کہ شکیل عثمانی صاحب نے پرویزیت پر جناب غامدی صاحب کی بھی ایک کتاب مرتب کی ہے جس پر خورشید ندیم صاحب نے دیباچہ تحریر کیا ہے۔ سہ ماہی 'فکر ونظر' کے نائب مدیر عبدالمتین شاہ صاحب نے راقم سے فون پر کہا کہ اس کتاب کے انداز بیان اور پیش کش میں 'ساحل' کی جھلک ہے بلکہ آپ کا ہی رنگ غالب ہے۔ راقم نے عرض کیا: شاگرد کے انداز تحریر میں استاد کا رنگ اگر جھلکے تو یہ غیر فطری رویہ نہیں..... رفتہ رفتہ ان کا اپنا رنگ ان شاء اللہ ابھرے گا۔

ظفر اقبال صاحب کی کتاب پر آپ نے ترقی اور ارتقاء کے تصورات کے حوالے سے جو نقد کیا ہے اس پر گہرے تفکر کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اس موضوع پر ایک سیمینار کا اہتمام کریں تو راقم الحروف، ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب اور ظفر اقبال صاحب ان سوالات کا جواب دیں گے جو عموماً ہر ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس موضوع پر اگر آپ Zed Books کی *Development Dictionary* گلبرٹ رسٹ کی کتاب *The History of Development* اور *Delusion of Economics* کو ایک نظر دیکھ لیں تو کچھ جوابات وہاں سے بھی مل جائیں گے۔ اس سلسلے میں جلد ظفر اقبال صاحب ایک مختصر مضمون آپ کو ارسال کریں گے۔ ساہیوال میں گزشتہ چند سالوں سے ہم نے محاضرات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں عموماً ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب اور راقم الحروف سہ روزہ گفتگو پیش کرتے ہیں۔ کوئی خاص موضوع یا عنوان لے کر ہم تین دن تک کل ۲۵ گھنٹوں کی ایک نشست کرتے ہیں۔ صبح فجر کی نماز سے لے کر رات دس بجے تک

کھانے اور نماز کے چند مختصر وقفوں کے ساتھ یہ گفتگو جاری رہتی ہے تا کہ ایک موضوع سے متعلق تمام پہلوز یر بحث آ ئیں۔سوالات کرنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے بلکہ نشست کے اختتام پر ہماری جانب سے دعوت ہوتی ہے کہ سوالات یا اشکال یا گفتگو کے متعلقات پر تنقیدی سوالات پوچھے جائیں۔یہ نشست حتی مطلع الفجر جاری رہنے کا عندیہ دیا جاتا ہے مگر عموماً رات ایک ڈیڑھ بجے تک یہ مجلس برخواست ہو جاتی ہے۔اگر آپ اپنے ادارے کے زیر اہتمام میڈیا، انسانی حقوق، جدیدیت اور پس جدیدیت، جدید علم کلام، سائنس، ٹیکنالوجی، سائنٹیفک امپریلزم، جمہوریت، سرمایہ داری، جدید ریاست کیا ہے؟ عہد حاضر میں اجتہاد، نصاب تعلیم، تعلیمی نصاب میں تبدیلیاں وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر اسی طرح کے سہ روزہ محاضرات کا اہتمام کریں تو یہ ایک نادر اور بہترین کام ہوگا اور ہر موضوع اپنے تاریخی اور مابعد الطبیعیاتی تناظر کے ساتھ سامعین پر واضح ہو جائے گا۔

آپ بہت سے قیمتی مباحث، نکات، موضوعات البرہان میں اُٹھاتے ہیں مگر البرہان کے صفحات ان کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہیں لہٰذا بہت سے مباحث تشنہ رہ جاتے ہیں اور ان پر ہونے والی نامکمل گفتگو مزید انتشار اور اختلال کا سبب بنتی ہے اور مغرب کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کے بجائے اسلامی علمیت کے بارے میں شبہات کا سبب بن جاتی ہے۔مغرب کے تین سو سال کی تاریخ وتہذیب سے اٹھنے والے مسائل اور فلسفے کا محاکمہ چند صفحوں میں ممکن ہی نہیں اور ان مباحث کا مکمل محاکمہ اور محاسبہ کئے بغیر عوام اور علماء تک اس خام متن کی ترسیل بہت سے مسائل پیدا کرتی ہے جن کو حل کرنا محال ہو جاتا ہے۔لہٰذا اس متن کی مکمل تنقیح از حد ضروری ہے اسے ہائیڈ پارک نہ بننے دیا جائے۔

ایک مرتبہ پھر میری جانب سے اپنی مخلصانہ کوششوں پر نذرانۂ عقیدت قبول فرمائیے۔آپ جیسے لوگ ہی اس ملت کا اثاثہ ہیں۔

مخلص،

سید خالد جامعی

کراچی

اردو کے حق میں فیصلے کی درخواست

بخدمت جناب جواد ایس خواجہ صاحب
چیف جسٹس، سپریم کورٹ آف پاکستان
اسلام آباد

جناب عالی! اردو کے حق میں آپ حکومت کو جو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ دستور پاکستان کی پاسداری کرے وہ حد درجہ لائق تحسین ہے اور ہمارے سمیت پوری قوم اس پر آپ کی تائید کرتی ہے اور آپ کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

جناب عالی! اخبارات سے پتہ چلا ہے کہ ملکی قوانین کے تحت آپ جلد ریٹائر ہونے والے ہیں۔ اس لیے یہ عریضہ آپ کی خدمت میں ارجنٹ میل سے ارسال کر رہا ہوں، اس درخواست کے ساتھ کہ آپ ریٹائر ہونے سے پہلے اردو زبان کے حق میں فیصلہ صادر کر کے جائیں اور من جملہ دوسری باتوں کے اس میں خصوصاً دو باتوں کا حکم دیں۔ ایک یہ کہ سارے پاکستان میں سکول سطح پر (یعنی پری سکول سے ہائر سیکنڈری تک) ذریعہ تعلیم اردو ہو (انگریزی نہ ہو)۔ اور دوسرے یہ کہ سول سروسز اور عدلیہ کے مقابلے کے امتحانات (CSP وغیرہ) بھی اردو میں ہوں (نہ کہ انگریزی میں)۔

آپ یقین جانیے یہ نہ صرف دستورِ پاکستان کا تقاضا ہے بلکہ یہ اتنا بڑا اور دوررس اہمیت کا فیصلہ ہوگا کہ پاکستانی قوم آپ کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کرتی رہے گی اور آپ کو خراج تحسین پیش کرتی رہے گی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آپ کو صحت و عافیت عطا فرمائے اور دنیا و آخرت کی حسنات سے نوازے۔ والسلام

نیازمند،

ڈاکٹر محمد امین
صدر تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، لاہور